سمے کا بندھن
ممتاز مفتی

سمے کا بندھن

افسانے

ممتاز مفتی

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

ترتیب

یہ کہانیاں

یہ کہانیاں نہ تو میں نے فن
کے لیے لکھی ہیں اور نہ ہی
زندگی کے لیے
یہ کہانیاں میں نے اپنے لیے
لکھی ہیں
دراصل یہ کہانیاں نہیں ہیں
یہ سب کچھ وہ ہے جو
میں نے زندگی میں پایا ——
کھویا
یہ میرے ہونٹوں پہ آیا ہُوا
تبسّم بھی ہیں، طنز سے پاک۔ میری آنکھ
سے گِرا ہُوا آنسو بھی ہیں۔

ممتاز مفتی
مارچ ۸۶ء

نقش

اُنس

نامی

کے نام

جنھوں نے مجھے دورِ جدید سے رُوشناس کیا

ممتاز مُفتی
مارچ ۱۹۸۶ء

سمے کا بندھن

آپی کہا کرتی تھی : سُنہرے، سمے سمے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سمے کا اپنا رنگ ہوتا ہے، اپنا اثر ہوتا ہے۔ اپنا سمے پہچان، سُنہرے۔ اپنے سمے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔

اب سمجھ میں آئی آپی کی بات۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی، آلنے سے نہ گرتی۔ سمجھ تو گئی۔ پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھن کی۔ آپی مجھے سُنہرے کہ کر بُلایا کرتی تھی۔ کہتی تھی : تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے۔ جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی، کٹھالی میں پڑے بنا۔ پھر یہ جھال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی۔

پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی، کہاں سے آئی تھی۔ کوئی لایا تھا۔ بالپن ہی میں آپی کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ اسی کی گود میں پلی۔ اسی کی سُرتال بھری بیٹھک کے جھولنے میں جھول جھول کر جوان ہوئی۔ پھر سنہرا اُمڈ اُمڈ آیا۔ چھپائے نہ چھپتا تھا۔ آپی بولی : نہ دھیے، چھپا نہ۔ جو چھپائے نہ چھپے اُسے کیا چھپانا۔

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپی ٹوکتی " یہ کیا کر رہی ہے بیٹی ؟ سیانے کہتے ہیں، جس کا کام اسی کو ساجھے۔ تیرا کام دیکھنا نہیں۔ دِکھنا ہے۔ تو نظر نہ بن منظر بن۔ اور جو دیکھے بھی تُو تو دِکھنے کا گھونگھٹ نکال۔ اس کی اوٹ سے دیکھ۔ پھر سمے دیکھ سنہرے۔ ابھی تو شام ہے۔ یہ سمے تو اداسی کا سمے ہے۔ دُکھ کا سمے ہے۔ شام بھئی گھن شام نہ آئے" آپی گنگنانے لگی " یاد ہے نا یہ بول ؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے۔ تیرا آنے کا سمے ہے۔ پگلی ذرا رُک جا۔ اندھیرا گاڑھا

ہونے دے۔ پھر تیرا ہی سمے ہوگا۔ پچھلے پہر تک۔"

ایک دن آپی کا جی اچھا نہ تھا۔ مجھے بُلایا۔ گئی۔ لیٹی ہُوئی تھی۔ سرہانے تپائی پر سوڈے کی بوتل دھری تھی۔ ساتھ نمک دانی تھی۔ یہ ان دِنوں کی بات ہے جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا۔ ٹھا کر کے کُھلتا تھا۔

بولی "سنہرے، بوتل کھول، گلاس میں ڈال۔ چُٹکی بھر نمک گھول اور مجھے پلا دے۔ میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اُٹھا۔ بُلبلے ہی بُلبلے۔ آپی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی" دیکھ لڑکی، یہ ہمارا سمے ہے۔ ہمارا سمے وہ ہے جب جھاگ اُٹھے۔ ہم میں نہیں۔ دوجے میں اُٹھے۔ دوجے میں جھاگ اُٹھانا یہی ہمارا کام ہے۔ خود شانت، دوجا بُلبلے ہی بُلبلے۔ جب تک جھاگ اُٹھتا رہے، ہمارا سمے۔ جب دوجا شانت ہو جائے، سمجھ لے، ہمارا سمے بیت گیا۔ اور جب سمے بیت جائے تو دھیرج پاؤں دھرنا۔ ٹھُمک نہ کرنا۔ ٹھُمک کا سمے گیا۔ چمک نہ مارنا۔ چمک کا سمے گیا۔ پایل نہ جھنکارنا۔ پایل کی جھنکار بیرن بھئی۔

پھر وہ لیٹ گئی۔ بولی "سنہرے، میری باتیں پھینک نہ دینا۔ دِل میں رکھنا۔ یہ بھیتر کی باتیں ہیں، اُوپر کی نہیں، سُنی سُنائی نہیں، پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب چھلکے ہوتی ہیں، بادام نہیں ہوتیں۔ جان لے بیٹی بات وہ جو بھیتر کی ہو۔ گہری ہو۔ چھلکا نہ ہو۔ جو بیتی ہو۔ جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی ہو۔ ہڈ بیتی۔ باقی سب جھُوٹ۔ دکھلاوا۔ بہلاوا۔"

آج مجھے باتیں یاد آ رہی ہیں۔ بیتی باتیں۔ بسری باتیں۔ سانپ گزر گئے۔ لکیریں رہ گئیں۔ لکیریں ہی لکیریں۔ سانپ تو صرف ڈراتے ہیں۔ پھنکارتے ہیں۔ لکیریں کاٹتی ہیں۔ ڈستی ہیں۔ پتا نہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے۔ چلتی ہیں۔ چلے جاتی ہیں۔ جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے۔ دوجی شُروع ہو جاتی ہے۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں: پیلی، رضیہ اور میں۔ پیلی بڑی، رضیہ منجھلی اور میں چھوٹی۔ پیلی میں بڑی آن تھی۔ پر مان نہ تھا۔ اس آن میں چھب تھی۔ سُندرتا بھرا ٹھہراؤ تھا۔ یُوں

رُعب سے بھری رہتی جیسے مٹیار رس سے بھری رہتی ہے۔گردن اُٹھی رہتی۔ مورتی سمان۔

روپ سُر ہی سُر تھی۔ شدھ سُر۔ تاروں سے بنی تھی۔ اس کے بند بند میں تار لگے تھے۔ سرتیاں سمرتیاں۔ اور وہ گونجتے مدّھم میں گونجتے اور پھر سُننے والوں کے دلوں کو جھلا دیتے تبھی میں تھی۔ آپی کہتی تھی؛ سنہرے تجھ میں دُکھ کی بھیگ ہے تو بھگو دیتی ہے۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے وہ جسے کو بھی ڈبو دیتی ہے۔ پگلی وہ جسے کو ڈبو یا کر خود نہ ڈوبا کر۔ مجھے تجھ سے ڈر آتا ہے سُنہرے۔ کسی دنا تُو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔

آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا مُنہ اُٹھایا اور چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے۔ وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر۔۔۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ لو دولتیے آتے تھے۔ پر ایسے بدمزا ہو کر جاتے کہ پھر رُخ نہ کرتے۔ آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں۔ اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں پر اُچھالیں گے تو بڑے اچھالیں۔ لڑکیو تم نہ اُچھلنا۔ جو نگاہوں پر اُچھل جاتی ہیں وہ مُنہ کے بل گرتی ہیں۔ اور جو گر گئی وہ سمجھ لو، نظروں سے گر گئی۔ پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دُوسروں جوگی۔

آپی کی بیٹھک میں نظریں نہیں چلتی تھیں۔ کان لگے رہتے تھے۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا۔ برہا کا ہوتا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں۔ نہ وہاں تماشا ہوتا نہ تماش بین۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہمارے ہاں ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دوجا نہیں آسکتا تھا۔ صرف ٹھاکر کے سنگی ساتھی۔

ٹھاکر بھی تو عجب تھا۔ اُوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہُوا۔ اندر جھانکو تو بچہ۔ نرم نرم، گرم گرم۔ ویسے تھا آن بھرا مان بھرا۔ سنگیت کا رسیا۔ یوں لگتا جیسے بھیتر

کوئی لگن لگی ہو۔ دھونی رمی ہو۔ آرتی سجی ہو۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپی عزت کرتی تھی۔ بھروسا کرتی تھی۔ ٹھاکر نے بھی کبھی نظر اٹھائی نہ تھی۔ جھکائے رکھتا۔ پیتا ضرور تھا، پر ایسی کہ جُوں جُوں پیتا جاتا اُلٹا مدھم پڑتا جاتا۔ آنکھ کی چمک گُل ہو جاتی۔ آواز کی کڑک بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا۔ جیسے بوتل کا نہ ہو، بھیتر کا ہو۔ بوتل اِک بہانہ ہو۔ بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی۔

ڈرو سکھیو ڈرو۔ بھیتر کے نشے سے ڈرو۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ یوں ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجا کے رُوبرو پنچ کھڑا ہو۔ بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے۔ بھیتر کا من کا بھونا بھلادیتا ہے۔ ڈرو سکھیو ڈرو بھیتر کے نشے سے ڈرو۔ بوتل کا تو کام کاج لوگ نہیں چھوڑتا، بھیتر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا۔ خود جوگا بھی نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا ریلا مجھے بھی لے ڈوبے گا۔

ہاں تو اس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے "گانٹھڑی میں کون جتن کر کھولوں۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی۔" گیت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ ٹھاکر جھوم جھوم جا رہا تھا۔ پھر کہو، پھر بولو کا جاپ کیے جا رہا تھا۔ نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگی تھی۔ اپنے من یا محبوب کے من کی۔ سمے بیتا جا رہا تھا۔ سمے کی سُدھ بُدھ نہ رہی تھی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ سمے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں، کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ اس روز وہ سمے ایسا ہی سمے تھا۔

دفعتاً گھڑی نے تین بجائے۔ آپی ہاتھ جوڑے اُٹھ بیٹھی۔ بولی "شما کرو ٹھاکر جی۔ معافی مانگتی ہوں۔ ہمارا سمے بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو۔"

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا۔ "نہ آپی،" وہ بولا "ابھی تو رات بھیگی ہے۔" آپی بولی "ٹھاکر ہم سُوکھے پروں والے پنچھی ہیں۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سمے بیت جاتا ہے۔ جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اڈاری نہ رہے گی۔ فن کار میں اڈاری نہ رہے تو باقی رہا کیا؟" ٹھاکر نے بڑی منتیں کیں۔ آپی نہ مانی۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہوگئیں۔ "آپی یہ سمے کا گورکھ دھندکیا ہے؟"
آپی بولی "لڑکیو سمے بڑی چیز ہے۔ ہر کام کا الگ سمے بنا ہے۔ رات کو گاؤ بجاؤ۔
پیو پلاؤ۔ بلو ملاؤ۔ موج اُڑاؤ۔ بس تین بجے تک۔ پھر بھور سمے اُس کا سمے ہے۔ اس کا نام جپو۔
اسے پکارو۔ فریاد کرو۔ دعائیں مانگو۔ سجدے کرو۔ اس سمے میں تم عیش نہیں کرسکتے۔ گناہ نہیں
کرسکتے۔ قتل نہیں کرسکتے۔ یہ دھندا جو ہمارا ہے اُس کے سمے میں نہیں چل سکتا۔ اُس کے سمے میں
پاؤں نہ دھرنا۔ اُس نے بُرا مانا تو ماری جاؤگی۔ جو وہ راضی ہوگیا تو بھی ماری جاؤگی۔ اور دیکھو اس
کے سمے کے نیڑے نیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرو کہیں وہ
تمھاری پکار سُن کر ہنکارا نہ بھر دے۔

پھر وہ دن آگیا جب میں نے اَن جانے میں سمے کا بندھن توڑ دیا۔ اس روز ٹھاکر آئے۔
آپی سے بولے "بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ آج رات
خواجہ کی محفل ہوگی ادھر حویلی میں۔ صرف اپنے ہوں گے گھر کے لوگ۔ تجھے لینے آیا ہوں چل میرے
ساتھ میرے گاؤں۔

آپی سوچ میں پڑگئی۔ بولی "رو پہ ماندی ہے۔ وہ تو نہیں جاسکے گی۔ کسی اور دن رکھ لینا
نذر نیاز۔"

"خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں۔" وہ بولا۔

"تو کسی اور منڈلی کو لے جا۔"

"ادنہوں" ٹھاکر نے مُنہ بنالیا "خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا۔ ان کا نام لینے کے
لائق کچھ تو ہو۔"

"میں کس لائق ہوں جو ان کا نام مُنہ پر لاؤں۔"

"بس اک تیری ہی بیٹھک ہے بائی جہاں لوتر تا ہے۔ جہاں جسم کا نہیں من کا ٹھکانا
ہے۔"

آپی مجبور ہوگئی۔ اس نے روپیہ کا دھیان رکھنے کے لیے پیلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر وہاں حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں، بہویں، بیٹیاں، ٹھاکرائی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھ لو بھجن منڈلی تھی اور خواجہ کے گیت "خواجہ میں تو آن کھڑی تورے دوار" سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سمے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں، دل ڈولے۔ آپی کا ڈوب ہی گیا۔ ٹھاکر اسے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا، شربت شیرا پلانے کو۔ پھر وہیں لٹا دیا

پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیگ گئی۔ آنکھیں بھر بھر آئیں۔ میں حیران ہیں تو کچھ مانگ نہیں رہی۔ میں تو التجا نہیں کر رہی۔ میں تو اک تاجر ہوں۔ پیسہ کمانے کے لیے آئی ہوں۔ میری آنکھیں کیوں بھر بھر آئیں خواہ مخواہ۔ سو میں بنا سوچے سمجھے گاتے چلی گئی۔ آنکھیں بھر بھر آتی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا۔ پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی گئی۔ سمے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ میں اُس کے سمے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپی تھی نہیں جو مجھے ٹوکتی۔

اور پھر مجھے کیا پتا تھا کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں تو غریب نہ تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا۔ خواہ مخواہ، زبردستی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس میں اتنی بھی سُدھ بُدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے۔ کون گا رہا ہے۔ کون منگتا ہے۔ کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کون بھری جھولی سمیٹ رہا ہے۔ میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دُکھی لوگ پکار پکار کر ہار جاتے ہیں، پر کوئی سنتا نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اتنا دیالو ہے۔ اتنا نیڑے ہے۔ اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔

پھر ٹھاکر بولا "سنہری بائی، بس اک آخری فرمائش: خواجہ پیا موری رنگ دے چُنریا۔ ایسی ہی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے دھوبیا دھوئے جائے ساری عمریا۔"

پھر مجھے سُدھ بُدھ نہ رہی۔ ایسی رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ بھیگ گئی۔ اور

میں ہی نہیں ساری محفل رنگ رنگ ہو گئی۔ انگ انگ بھیگا۔ خواجہ نے رنگ گھاٹ بنا دیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں میں نہ تھی۔ دل رویا رویا۔ دھیان کھویا کھویا۔ کسی بات میں چت نہ لگتا۔ بیٹھک بے گانہ دکھتی۔ سازیں طرب نہ رہا۔ سارنگی روتے جاتی۔ اُستاد نکو خاں بجاتے پردہ روئے جاتی۔ طبلہ سر پیٹتا۔ گھنگھرو کہتے پاؤں میں ڈال اور بن کو نکل جا۔ وہاں اس کا جھومر ناچ جو پتے پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ بھیں بھیں کر روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ پیلی حیران، روبہ کا مُنھ کُھلا، آپی چُپ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپی بولی: بس پتر، تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانا پانی ختم ہو گیا۔ تُو نے اُس کے سمے میں پاؤں دھر دیا۔ اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اس دھندے جوگی نہیں رہی۔

"پر کہاں جاؤں آپی؟ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لیے۔"

"جس نے بُلایا ہے اس کے دربار میں جا" روبہ بولی۔

"اُس بھیڑ میں جائے،" آپی بولی "یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے۔ نہیں، یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اسی کوٹھڑی میں رہے گی، بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی۔

پھر پتا نہیں کیا ہُوا۔ رقت ختم ہو گئی۔ دِل میں اِک جنُون اُٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں۔ کسی ایک کی۔ تن من دھن سے اسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اُس کے جُوتے اُتاروں۔ پنکھا کروں۔ پاؤں دابوں۔ سر میں تیل مالش کروں۔ اس کے لیے پکاؤں۔ میز لگاؤں۔ برتن رکھوں۔ اس کی بنیانیں دھوؤں۔ کپڑے استری کروں۔ آرسی کا کول بناؤں پھر سرہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے کب پانی مانگے۔

ایک دن آپی بولی "اب کیا حال ہے دھیے؟" میں نے رو رو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا۔

بولی "وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟"

"اونہوں کوئی نظر میں نہیں"

"ناک نقشہ دکھتا ہے کبھی؟"

"نہیں آپی"

"کوئی بات نہیں" وہ بولی "جو کھونٹی پر لٹکانا مقصود ہے تو آپ کھونٹی بھیجے گا۔"

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا۔ آپی داخل ہوئی بولی "خواجہ نے کھونٹی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟"

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی زمیندار ہے۔ ادھیڑ عمر کا ہے۔ کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا۔ سنہری بائی کو سنا تھا۔ جب سے اب تک اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کیے۔ کوئی پیش نہیں گئی۔ اب ہار کے تیرے در پہ آیا ہوں۔ بول تو کیا کہتی ہے؟ منھ مانگا دوں گا۔

میں نے کہا "دے دے سال کے لیے بخش دے۔ جیسے تیری مرضی۔" آپی ہنسنے لگی۔ پھر بولی "چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر۔"

"اونہوں" میں نے سر ہلا دیا "نہیں آپی۔ انھوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔ دیکھنے کا مطلب؟"

"کتنی دیر کے لیے مانوں؟"

"جیون بھر کے لیے۔"

"سوچ لے۔ جو اوباش نکلا تو؟"

"پڑا نکلے۔ کیسا بھی ہے جیسا بھی نکلے۔"

اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔ آپی نے رد کر دیا لوٹا دیا۔ بولی "سودا نہیں کر رہی اپنی دھی وداع کر رہی ہوں۔ اور یاد رکھ یہ خواجہ

کی امانت ہے۔ سنبھال کر رکھیو۔"

حویلی یوں اُجڑی اُجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔

ویسے تو سبھی کچھ تھا۔ سازو سامان تھا۔ آرائش تھی۔ قالین بچھے ہوئے تھے۔ صوفے لگے ہوئے تھے۔ قدِ آدم آئینے۔ جھاڑ فانوس سبھی کچھ۔ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرانی بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے۔ مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے، کہاں ہے، کیوں ہے۔

اُوپر سے شام آ رہی تھی۔ سمے کو سمے ٹکراتی۔ اُداسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔ یادوں کے دیے جلاتی۔ بیتی باتوں کے الاپ گنگناتی۔ دبے پاؤں۔ مدھم۔ یوں جیسے پائل کی جھنکار بسر نیا ہو۔

دُور، اپنے کوارٹر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نگاہیں چھوٹی چودھرانی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقّے کا سُوٹا لگاتا اور پھر سے چھوٹی چودھرانی کو دیکھنے لگتا۔ یوں جیسے اسے دیکھ دیکھ کر دکھی ہوا جا رہا ہو۔

دُوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بُوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا تھا۔ ہر دو گھڑی کے بعد سر اُٹھاتا اور چھوٹی چودھرانی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا۔ پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کاٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنّت بی بی، جو چھوٹی چودھرانی کا کھانا پکاتی تھی، دو تین بار برآمدے کے پرلے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ گئی تھی۔ جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ پلّو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کمین چھوٹی چودھرانی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے

تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔ اس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دوجوں کا محتاج بنا لیا تھا؟ کیوں؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا۔ اپنی اولاد تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بقائمی ہوش وحواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرانی کے نام گفٹ کر گیا تھا تو اسے کیا حق تھا کہ اپنا تمام تر حصہ بڑی چودھرانی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرانی نے اسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گا؟

ایک طرف تو اتنی بے نیازی کہ اتنی بڑی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی، اور دوسری طرف یوں سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھ رہتی ہے۔ سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرانی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے۔ چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ جب سے یونہی حواس گم قیاس گم بیٹھی رہتی ہے۔ اور اور پھر ٹوٹتی رات سمے اس کے کمرے سے گنگنانے کی آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیجو خبریا۔ کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرانی پر انھیں پیار ضرور آتا تھا۔ پر اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے۔

چھوٹی چودھرانی کو صرف ایک سوچ لگی تھی۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی۔ بول تیرا جیون کس کام آیا؟ وہ سوچ سوچ ہار جاتی، پر اس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا۔ الجھے الجھے خیال الجھاتے۔ مجھے چمن سے اکھیڑا۔ بیل بنا کر اک درخت کے گرد گھما دیا اور اب اس درخت کو اکھیڑ پھینکا۔ بیل مٹی میں مل گئی۔ اب یہ کس کے گرد گھومے؟ بول میرا جیون کس کام آیا؟

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے روبرو کھڑا ہے۔ سر اٹھایا سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا۔

''کیا ہے؟'' وہ بولی۔

"میں ہُوں پٹواری چھوٹی چودھرانی جی۔"

"تو جا، جاکر بڑی چودھرانی سے مِل۔ مجھ سے تیرا کیا کام؟"

"آپ ہی سے کام ہے" وہ بولا۔

"تو بول کیا کہتا ہے؟"

"گاؤں میں دو درویش آئے ہیں۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انھیں چند دِن یہاں روکا جائے۔ جو آپ اجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے میں ٹھہرادیں۔"

"ٹھہرادو" وہ بولی۔

"نوکر چاکر، بندوبست" وہ رُک گیا۔

"سب ہوجائے گا۔"

پٹواری سلام کرکے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اس نے سرسری طور پر پُوچھا "کہاں سے آئے ہیں؟"

پٹواری بولا "اجمیر شریف سے آئے ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں۔" اِک دھماکا ہُوا چھوٹی چودھرانی کی بوٹیاں ہوا میں اچھلیں۔

اگلی شام چھوٹی چودھرانی نے جنّت بی بی سے پُوچھا "جنّت یہ جو درویش ٹھہرے ہُوئے ہیں یہاں، ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟"

جنّت بولی "لو چھوٹی چودھرانی وہاں تو سارا دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بڑے پہنچے ہُوئے ہیں۔ جو مُنھ سے کہتے ہیں ہوجاتا ہے۔"

"تو تیار ہوجا جنّت ہم بھی جائیں گے۔ تُو اور میں۔"

"چودھرانی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔"

"تُو چل تو سہی۔" چودھرانی نے خُود کو چادر میں لپیٹتے ہُوئے کہا "اور دیکھ وہاں مجھے چودھرانی کہہ کر نہ بُلانا۔ خبردار!"

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنّت نے دروازہ کھٹکھٹایا کون ہے؟
اندر سے آواز آئی۔ جنّت نے پھر دستک دی۔ سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔
جنّت زبردستی اندر داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے چودھرانی تھی۔ سفید ریش گھبرا گیا۔ بولا: "سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ وہ اُس کمرے میں مشغول ہیں۔

"ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے" چھوٹی چودھرانی بولی۔

"تو پھر؟" سفید ریش گھبرا گیا۔

"ایک سوال پوچھنا ہے۔" چودھرانی نے کہا۔

"سائیں بابا اس سمے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔"

"سائیں بابا نے جواب نہیں دینا۔ انھوں نے پوچھنا ہے" وہ بولی۔

"کس سے پوچھنا ہے؟" خادم بولا

"اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالکے ہیں۔" یہ سُن کر سفید ریش خادم سُن ہو کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"ان سے پوچھو" چھوٹی چودھرانی نے کہا "ایک عورت تیرے دوار پہ کھڑی پوچھ رہی ہے: ہے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟"

کمرے پر منوں بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔

چھوٹی چودھرانی بولی "کہو وہ عورت پوچھتی ہے: تُو نے بیٹھک کے گملے سے اِک بُوٹا اکھیڑا۔ اسے بیل بنا کر ایک درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اس پر نثار ہوتی رہ۔" وہ رُک گئی۔ کمرے کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔ "اب تُو نے اس درخت کو اکھیڑ پھینکا ہے۔ بیل مٹی میں رُل گئی۔ وہ بیل پوچھتی ہے: بول میرا جیون کس کام آیا؟" یہ کہہ کر وہ چُپ ہو گئی۔

"تیرا جیون کس کام آیا۔ تیرا جیون کس کام آیا" سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے۔ "تُو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟" وہ رُک گیا۔ کمرے کی خاموشی اتنی بوجھل ہو گئی کہ

سہاری نہیں جاتی تھی۔

"میری طرف دیکھ" سفید ریش خادم نے کہا "سنہری بائی، میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا۔ مجھے نہیں پہچانتی، میں تیرا سارنگی نواز تھا۔ دیکھ میں کیا تھا کیا ہو گیا۔"

چھوٹی چودھرانی کے منہ سے ایک چیخ نکلی "استاد جی، آپ!" وہ استاد کے چرن چھونے کے لیے آگے بڑھی۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھرکم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

"سنہری بی بی" وہ بولا "مجھ سے پوچھ تیرا جیون کس کام آیا!"

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا۔ "ٹھاکر" وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا "اب ہمیں پتا چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا۔" اس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ بولا "بی بی ہمیں آشیرباد دے۔"

ساری بات

نہیں، یہ ڈاکٹر نہیں سمجھے گا۔ بات کرتی ہُوں تو ہڑ بڑ میری طرف دیکھتا رہتا ہے۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بار بار کہتی ہُوں : ڈاکٹر مجھ پہ خوف طاری ہے۔ کوئی ایسی دوا دیجیے کہ یہ دُور ہو جائے یا اس کی ٹینشن میں کمی آجائے۔ وہ کچھ جواب نہیں دیتا۔ ادھر میرے خوف کی طنابیں تو کستی ہی جا رہی ہیں۔ روز بروز ایک ٹینشن ہے۔ جکڑن جو بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر پُوچھتا ہے: کوئی اِرریشنل فیئر ہے کیا؟ لو! وہ تو لازماً اِرریشنل ہوگا۔ ریشنل ہو تو کوئی بات ہی نہ ہو۔ سانپ کو دیکھ کر ڈر جاؤں تو ٹھیک ہے۔ ڈرنا ہی چاہیے۔ لکیر کو دیکھ کر ڈروں تو ظاہر ہے کوئی گھنڈی ہے۔ کہیں گرہ لگی ہے۔ کوئی کَم چھوڑا ہے۔ تبھی تو مشورے کے لیے آئی ہوں۔

مجھ سے پُوچھتا ہے : کس بات کا خوف ہے؟ کہتی ہُوں : اس بات کا کہ کہیں میں بھُول نہ جاؤں۔ اس پر وہ پُوچھتا ہے : کیا بھُول نہ جاؤ؟ کہتی ہوں : یہ بھُول نہ جاؤں کہ میں کون ہُوں۔ گھر میں میری کیا حیثیت ہے۔ کیا مقام ہے۔ اِس پر وہ بالکل ہی کنفیوزڈ ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر چُپ رہتا ہے، پھر کہتا ہے : ساری بات بتایئے، بیگم صاحبہ۔

اب میں اُسے ساری بات کیسے بتاؤں۔ چاہوں بھی تو نہیں بتا سکتی۔ ساری بات بھلا کسی نے بتائی ہے کبھی۔ ماں باپ نہیں بتاتے۔ باپ تو خیر بالکل نہیں بتاتا۔ ماں بھی آدھی بتاتی ہے۔ سہیلیاں چاہے ساری بتا دیں۔ پر وہ ساری نہیں ہوتی۔ بتاتے ہُوئے دو ایک گھنڈیاں بند کر لیتی ہیں۔ دُوسروں سے کہہ دینے کی بات چھوڑیے۔ ساری بات تو ہم خود سے بھی نہیں کرتے۔ پھر میں کیسے بتاؤں، ڈاکٹر کو ساری بات؟

حیران ہوں کہ ڈاکٹروں کے پاس خوف کی دوا ابھی نہیں ہے۔ آج کل تو ساری بیماریاں ذہنی ہوتی ہیں۔ خوف ہے۔ انگزائٹی ہے۔ بے چینی ہے۔ کم خوابی ہے۔

امی کو ڈیوڈینل السر ہوا تھا۔ ڈاکٹر کہتا تھا: انگزائٹی کی وجہ سے ہے۔ پھر اس نے علاج السر کا کیا، انگزائٹی کا نہیں۔ وہی بات ہوئی، پیٹ میں درد ہو، آنکھ میں سلائی لگا دی۔

میرا یہ خوف سوہانِ روح ہو رہا ہے۔ حال ہی کی پیداوار ہے۔ شادی ہوئے دو سال تو ہو رہے ہیں۔ شادی سے پہلے کوئی خوف نہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ شادی کے بعد خوف نے مجھے کیوں آ جکڑا!

ڈاکٹر کہتا ہے: یہ ماحول کی وجہ ہے۔

شادی کے بعد تو میرا ماحول بالکل کشادہ ہو گیا ہے۔ کوئی فکر نہیں، کوئی پریشانی نہیں تنگی نہیں، ترشی نہیں۔ اِتنا آرام تو کبھی مجھے نصیب نہ ہوا تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہ رہی ہوں۔ میاں جان چھڑکتے ہیں۔ دیکھے بغیر دم نکلتا ہے۔ ہر وقت میرے پھیرے لیتے رہتے ہیں۔ جو مانگوں حاضر۔ جو چاہوں موجود۔ میں تو یوں زندگی گزار رہی ہوں جیسے شیشے کے مرتبان میں اُگا ہوا کنول ہو۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ جو چاہوں کروں۔ جیسے چاہوں جیوں۔ سر پر نہ ساس ہے، نہ سسر نہ بڑا، نہ بزرگ۔ گھر میں بس نوکر ہی نوکر ہیں۔ مالی ہے۔ چوکیدار ہے۔ خانساماں ہے۔ میڈ ہے۔ یا ہم چاروں میں ملک فاروق ہیں۔ میں ہوں۔ امان ہے۔ جہاں آرا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے، اتنے کیئر فری ماحول میں ڈر خوف کی گنجائش ہے کیا؟ شادی سے پہلے البتہ کچھ کچھ انگزائٹی تھی۔ امی کو زیادہ، مجھے کم کم۔ میں تو جب سے جوان ہوئی ہوں، بے فکری میں ہی گزری ہے۔ امی ابا کے یہاں میری حیثیت پھول مالا کی تھی۔ ہر دم تازہ، ہر وقت خوشبو۔ امی ایک ایک پھول بڑی محنت سے پروتی تھی۔ بڑے خیال سے پانی کے چھینٹے لگاتی تاکہ تازگی میں فرق نہ آئے۔

امی کی بس ایک ہی خواہش تھی۔ ایک ہی فکر میں گھلی جاتی تھی کہ کب کوئی سر نوائے اور پھول مالا اس کی گردن میں ڈال دے۔ نہیں، کوئی سا سر نہیں —— ایسا سر جس پہ پہلے سے

ہی دولت یا سٹیٹس کا تاج دھرا ہو۔ کسی ایک سر کی بات ہوتی تو اتنا لمبا چکر نہ پڑتا۔ پتا نہیں ان حالات میں کیا ہوتا۔ بہر حال، یہ کچھ نہ ہوتا جو ہُوا۔

ساری عمر مجھے بنی سجی پلیٹ بن کر جینا پڑا۔ امّی کا یہی مطالبہ تھا کہ ہر وقت بنی سجی پلیٹ بن کر رہوں اور موقع آنے پر اس کے اشارے کی منتظر رہوں۔ جوں ہی وہ اشارہ کرے، خود کو پیش کر دوں۔ امّی ہر وقت مجھے بناتی سجاتی رہتی۔ پلیٹ پر پستے بادام لگاتی رہتی۔ چاندی کے ورق سجاتی رہتی۔ میری ہر بات پر کڑی نظر رکھتی۔ یہ پہنو، وہ نہ پہنو۔ یوں پہنو، یوں نہیں۔ یُوں اُٹھو، یوں بیٹھو۔ یُوں مسکراؤ، یوں بات کرو۔ یوں ڈرنکس سرو کرو۔ یوں چائے بناؤ۔ یوں پان پیش کرو۔ یوں دیکھو۔ یوں مسکاؤ۔

ہم دو بہنیں تھیں۔ میں اور رمنا۔ میں بڑی تھی۔ لہٰذا ساری توجہ مجھ پر مرکوز تھی۔ دقّت یہ تھی کہ ہم دونوں بہنوں میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ نظروں پر چڑھ جاتیں، چونکاتیں یا توجہ طلب کرتیں۔ عام سے خدوخال، عام سا رنگ، عام سے جسم۔ جوانی آئی تو وہ بھی مدھم مدھم۔ پتا ہی نہ چلا کہ آئی ہے۔

جوانی کا بھی کسی نے بھید نہیں پایا۔ کسی کو باہر آتی ہے، کسی کو اندر۔ وہ میری سہیلی ثمر تھی۔ سُوکھی چڑنگھ۔ یوں جوانی ٹوٹ کر آئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے میلہ لگ گیا۔ اِتنی پھُول پتّیاں نکلیں کہ بُوٹے سے چمن بن گئی۔ ساری جوانی باہر ہی ڈھیر ہو گئی۔ ایسی شہنائیاں بجیں کہ دُور سے پتا لگتا تھا کہ جوانی آئی ہے۔

پھر وہ نادرہ تھی۔ باہر کُچھ بھی نہ ہُوا، اندر ایسی چکریاں چلیں کہ ٹِک کر بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ ایک بے چینی تھی کہ جینے نہیں دیتی تھی۔ بے چاری کو قرار نہیں آتا تھا۔ کچھ ایسی بھی ہیں جن کا اندر اور باہر دونوں رنگے جاتے ہیں۔ باہر پھُول کھِل جاتے ہیں، اندر لڈّو پھُوٹتے ہیں۔

مُجھے تو کُچھ بھی نہ ہُوا۔ نہ باہر پھُول کھلے، نہ اندر لڈّو پھُوٹے۔ اندر پھوار سی ضرور پڑی تھی۔ باہر سُوکھی کی سُوکھی ہی رہی۔ اس پر بے چاری امّی کو السر کیوں نہ ہوتا بھلا۔ انگزائٹی کی چکری کیوں نہ

جلتی۔ میرے متعلّق جو منصوبے امّی ابّا نے بنائے تھے، ان میں ذرا بھی تو بڑھاوا نہ ملا۔

میرے ابّا امّی بڑے باخبر تھے۔ پتا رکھتے تھے کہ اُونچے حلقوں میں کون آیا، کون گیا۔ شرط یہ تھی کہ اُونچے گریڈ کا ہو یا کاروباری ہو۔ ہر نئے آنے والے کے کوائف کا انھیں علم ہوتا تھا، خصوصًا جن کے گھر نوجوان بیٹے ہوں۔ وہ بڑے اہتمام سے ہر نووارد کے گھر سوشل وزٹ کرتے۔ پہلی مرتبہ اکیلے جاتے۔ دوسری بار مجھے ساتھ لے جاتے۔ حالات سازگار ہوتے تو کسی نہ کسی بہانے نوجوان بیٹے کو اپنے ہاں بلاتے۔ اس روز امّی کی خاص توجہ مجھ پر مرکوز ہوتی۔ پلیٹ پہ نئے پستے بادام لگائے جاتے۔

کچھ دیر تو ڈرائنگ روم میں ہنس ہنس کر باتیں ہوتیں، پھر دفعتًا امّی ابّو کو ایک ضروری کام یاد آجاتا۔ مجھ سے کہا جاتا "امنا، ہم ابھی آئے۔ تم ذرا آصف کے ساتھ کیرم بورڈ لگاؤ۔ بھئی، آصف کا دل لگائے رکھنا جب تک ہم لوٹیں۔"

مجھے یاد ہے، سب سے پہلے پیرزادہ کے گھر کنڈی ڈالی گئی۔ کنڈی ڈال کر مسلسل ایک سال بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ ان کا بیٹا امجد اس قدر کتابی تھا کہ کھیل کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ جیتی جاگتی کتاب کاغذی کتاب سے زیادہ جاذب ہوتی ہے۔ لیکن امجد کی ماں کے رشتہ داروں میں بہت سی لڑکیاں تھیں۔ چند بہت ہی منظورِ نظر۔ اس لیے بات نہ بنی۔

پھر خان صاحب سے رسم و راہ بڑھائی۔ ان کا بیٹا سعید چل نکلا۔ بڑا ملنسار تھا۔ امّی کی اُمیدیں بندھ گئیں۔ لیکن جلد ہی والدین چوکنے ہو گئے۔ بیٹے کو لگام ڈال دی۔ بات واضح ہو گئی کہ وہ اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں۔

پھر بٹ صاحب کو آزمایا۔ لیکن جلد ہی پتا چل گیا کہ اُن کا بیٹا منسوب ہے اور شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

کنڈی ڈالنے کی جگہیں بار بار بدلی گئیں۔ طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمائے گئے۔ بیڈ روم میں اِن ڈور گیمز کی بازیاں لگیں۔ کتابوں پر تبصرے کیے گئے۔ سنیکس چلے۔ چائے اور کافی کے

پیالے چلے۔ پاپ میوزک چلی۔ پکنک کے پروگرام بنائے گئے۔ کیا کچھ نہ ہُوا۔ مگر کچھ بھی نہ ہُوا۔ بات جہاں دھری تھی، وہاں دھری رہی۔ صرف وقت ہاتھ سے نکلتا گیا۔ عمر گزرتی گئی۔ امی کی انگزائٹی بڑھتی گئی۔ السر اُبھرتا گیا۔ یُوں چھ سال گزر گئے۔ گھر پر مایوسی کی فضا مسلط ہوتی گئی۔ پھر دفعتاً اندھیرے میں ایک نئی کرن پھُوٹی۔ ملک فارُوق سے تعارُف ہوگیا۔ وہ خود ہمارے ہاں آگئے۔

ملک فاروق بہُت ہی خوش مزاج آدمی تھے۔ اُونچے لمبے، گورے، چِٹّے، ملنسار، اگرچہ پچاس کے ہوں گے، لیکن طبیعت ایسی رنگین جیسے تیس کے ہوں۔ گھر کا ماحول بھی بہُت سازگار تھا۔ بیوی فوت ہوچکی تھی۔ بڑا بیٹا انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ اس کی چھوٹی بہن جہاں آرا بی۔اے میں تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا میل ملاپ اس قدر بڑھا کہ چھُٹّی کا دن یا تو ملک فیملی ہمارے ہاں گُزارتی، یا ہم ان کے ہاں چلے جاتے یا پکنک کے لیے کہیں باہر جا ڈیرا لگاتے۔

ملک صاحب کا بیٹا امان بہُت ہی پیارا ساتھی تھا۔ اُونچا لمبا، خوش شکل۔ اس کی بات میں مردانہ جھلک تھی۔ ایک عجب شانِ بے نیازی۔ اُسے دیکھ کر مُجھے ایسا لگا جیسے میرے آئیڈیل میں جان پڑگئی ہو۔ سچّی بات یہ ہے کہ امان کو دیکھ کر میرے تو پر بھیگ گئے۔ امی کے اشاروں پر میں نے کئی ایک نوجوانوں سے رابطہ پیدا کیا تھا لیکن خود کبھی انوالو نہیں ہُوئی تھی۔ کُنڈی ضرور ڈالی تھی لیکن خود کیچوا نہ بنی تھی۔

امان میں بیک وقت بے تکلّفی بھی تھی، بے نیازی بھی۔ وہ میرے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا، بحثیں کرتا، گیم کھیلتا، پاپ میوزک سُنتا، چائے پیتا۔ لیکن اُسے کبھی احساس نہ ہُوا تھا کہ پاس ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ یہ بات مجھے بہُت کھلتی تھی۔

اس کے برعکس بڑے ملک صاحب بڑے ہی رنگیلے تھے۔ مجھ سے بہُت مانوس تھے۔ زبردستی پاس بٹھا لیتے۔ اپنے پُرانے قصّے سُناتے۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے۔ آنکھ میں چمک لہراتی، بڑی زور دار، بڑی متکلم۔ میں تو گھبرا جاتی۔

ملک فیملی سے میل جول کے بعد امّی کی نگاہ میں اُمید کی کرن روشن ہو گئی ۔ اُن کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں ۔ اُن میں منت تھی ، بے بسی بھری منت ، التجا " امنا ، اب اس کشتی کی تو ہی کھویا ہے ۔ پتوار تیرے ہاتھ میں ہے "

امّی کی نگاہوں میں اتنی التجا تھی کہ میں نے وہ قدم اُٹھا لیا جو شاید کبھی نہ اُٹھاتی ۔ اس رات ہم امان کے بیڈ روم میں بیٹھے منا پلی کھیل رہے تھے ، امان ، جہاں آرا اور میں ۔ گھڑی نے نو بجا دیے ۔ میں چونکی " بہت دیر ہو گئی ۔ امّی انتظار کر رہی ہوں گی ۔ جہاں آرا ، ذرا امّی کو فون تو کر دے کہ ڈرائیور کو بھیج دیں " جہاں آرا اُٹھ کر چلی گئی ۔ میں اور امان اکیلے رہ گئے اور میں نے وہ قدم اُٹھا لیا ۔ بھرپور انگڑائی لی ۔ ہے ، میں تو تھک گئی کہ کر اپنا سر امان کی گود میں رکھ دیا ۔

اس نے میرا سر نیچے پٹخ دیا ۔ تڑپ کر اُٹھا "میں کیا سرہانہ ہوں ؟ اس کی آواز میں غصہ تھا ۔ پھر وہ میرے سامنے آکھڑا ہوا ۔ مجھے مخاطب کر کے بولا " آئینہ دیکھا ہے کبھی ؟"

اُس کے اِس فقرے نے مجھے کاٹ کر رکھ دیا ۔ جیسے میرے مُنھ پر تھوک دیا ہو ۔ اندر بھڑوں کا ایک چھتا چھڑ گیا ہو ۔ دیوانہ وار میں کمرے سے باہر نکل آئی ۔ فون کی طرف بھاگی ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ توڑ پھوڑ کر رکھ دوں ۔ انتقام ، انتقام ۔ دفعتہً میں رُک گئی ۔ سامنے بڑے ملک فاروق کا بیڈ روم تھا ۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی ۔

نہیں ، ڈاکٹر میری بات نہیں سمجھے گا ۔

پُوچھتا ہے : کیسا خوف ؟ کہتی ہُوں : اس بات کا کہ کہیں میں بھُول نہ جاؤں کہ میں کون ہُوں ۔ گھر میں میری کیا حیثیت ہے ، کیا مقام ہے ۔ اس پر وہ کنفیوزڈ ہو جاتا ہے ۔ پھر کہتا ہے : بیگم فاروق ، ساری بات بتائیے ۔ اب میں اسے ساری بات کیسے بتاؤں ؟

پچٹ کپڑی

دو سال کے بعد میں فرید آباد آیا تھا۔ ائیر پورٹ پر اُترتے ہی میں نے محسوس کیا کہ فرید آباد میں بہت تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ ٹیکسی والے کو میں نے ایلیٹ ہوٹل میں جانے کو کہا۔ دو سال پہلے بھی میں ایلیٹ میں ہی ٹھہرا تھا۔ مجھے کسی اور ہوٹل کا علم نہ تھا۔

اِتفاق سے ایلیٹ ہوٹل میں وہی کمرا مِل گیا جہاں میں پہلے ٹھہرا تھا۔ پُرانی یادیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔ مجھے راحیل راؤ یاد آ گیا۔

راحیل راؤ میرا پہلا پیشنٹ تھا۔ اس زمانے میں مَیں امریکہ سے تحصیلِ علم کرنے کے بعد وطن واپس آیا تھا۔ ابھی باقاعدہ پریکٹس شروع نہیں کی تھی۔ کلینک کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اسی سلسلے میں فرید آباد آنا ہُوا تھا۔

ہوٹل میں جب مجھے راؤ کا فون آیا تھا تو میں بہت حیران ہُوا تھا۔ کوئی شخص کہہ رہا تھا:

ڈاکٹر صاحب، میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہُوں۔ کیس بے حد اہم ہے۔ فوری توجہ نہ ملی تو پتا نہیں، کیا ہو گا۔

اس فون پر میں حیران ہُوا کہ اسے کیسے پتا چل گیا کہ میں تحلیلِ نفسی کا ڈاکٹر ہوں اور ایلیٹ میں ٹھہرا ہُوا ہُوں۔

بہر حال، میں نے مسٹر راؤ کو بُلا لیا تھا۔

مسٹر راڈ باڈ قسم کا نوجوان تھا۔ تیس پینتیس کے درمیان۔ پڑھا لکھا۔ کھاتا پیتا۔ کلچرڈ گھرانا۔ رکھ رکھاؤ کا دلدادہ۔ ایک بات عجیب تھی۔ حرکت کا دلدادہ ہونے کے باوجود اس میں توازن کی اہلیت نمایاں تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ، تفکر یا پریشانی کا عنصر مفقود تھا۔

کرسی پر بیٹھتے ہی وہ بولا "ڈاکٹر، میں سخت ڈسٹرس میں ہوں۔ مجھے اس مشکل سے نجات دلائیے۔ ورنہ ــــــ ورنہ پتا نہیں کیا کر بیٹھوں۔"

"کیس کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے مجھے یہ بتائیے کہ محبت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

محبت کا نام سن کر میرا ذہنی تناؤ ختم ہو گیا۔ محبت تو کوئی بڑی مشکل نہیں۔ مغرب میں تو محبت کا مفہوم جنسی طلاپ ہوتا ہے، یا توجہ طلبی کا جنون، اور بس۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" میں نے کہا۔

"میرا مطلب ہے، کیا آپ محبت کو صحت مند جذبہ سمجھتے ہیں یا بیماری؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا، جب تک آپ کوائف بیان نہ کریں۔"

"ڈاکٹر صاحب، میری پرابلم محبت نہیں" وہ بولا "محبت کو ہم لوگ پرابلم نہیں سمجھتے۔ میری مشکل یہ ہے کہ مجھے بیک وقت دو لڑکیوں سے محبت ہے۔"

میرے دل میں کیس کی رہی سہی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ مغرب میں تو بیک وقت چار چار افیئرز چلتے ہیں۔ کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی۔ پھر دفعتہً مجھے خیال آیا کہ شاید سنس آف گلٹ نے گڑبڑ کر رکھی ہو۔ مشرق میں ایک لڑکی سے محبت کرنا قابلِ تحسین فعل سمجھا جاتا ہے، لیکن بیک وقت دو لڑکیوں سے محبت کرنا قابلِ نفرین بات۔

"ہاں ہاں" میں نے مسٹر راڈ سے کہا "آپ پورے کوائف بیان کرتے جائیے۔ رکیے نہیں۔"

"اور وہ دونوں لڑکیاں ایک دوسری کی ضد ہیں، ڈاکٹر" وہ بولا "ایک مدھم، منی منی۔ دوسری شوخ بھڑک کر جلنے والی۔ ایک سحر، دوسری دوپہر۔ ایک گونگی، دوسری قینچی۔ ایک سکون،

دُوسری ہلچل۔ ایک میٹھی، دُوسری مرچیلی" وہ جذباتی ہو گیا۔

"ہُوں ___ ان دونوں کا آپ کی طرف ردِ عمل کیا ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"پازیٹو، ڈاکٹر" وہ بولا "دونوں ہی مجھے میسر ہیں۔"

"اچھا! وہ کیسے؟" میں نے پُوچھا۔

"ایک میری بیوی ہے" وہ بولا "دُوسری میری سیکرٹری ہے۔"

"اوہ!" میں چونکا "پھر تو کوئی پرابلم نہیں ہونی چاہیے۔"

"ہے، ڈاکٹر، ہے" وہ بولا "ہے"۔

"سنس آف گلٹ ہی ہو سکتی ہے۔"

"وہ بھی ہے، ڈاکٹر۔ مجھے ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ انھیں میری ذہنی کیفیت کا علم نہ ہو جائے۔ اگر ہو گیا تو مُشکل پڑ جائے گی۔ دونوں ہی خوددار لڑکیاں ہیں۔"

"کیا انھیں ایک دُوسری کے بارے میں علم نہیں؟"

"نہیں، ڈاکٹر۔ میری بیوی امنا کو شک ہے اور سیکرٹری مونا سمجھتی ہے کہ بیوی سے میرا رسمی رشتہ ہے۔ محبت صرف اسی سے ہے۔ پھر بھی کبھی کبھار مونا کو بھی شک پڑ جاتا ہے۔"

"وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"وجہ میں خود ہوں" وہ بولا "ڈاکٹر، اپنی زندگی کی سب سے بڑی مُشکل میں خود ہُوں۔"

"حیرت ہے!" میں نے کہا "کیا آپ بات چُھپانے کی اہلیت نہیں رکھتے؟"

"بہت، ڈاکٹر، بہت اہلیت رکھتا ہُوں۔ لیکن بات ہی کچھ ایسی ہے کہ میں خود اپنا راز اُچھال دیتا ہُوں ___ میں سمجھاتا ہُوں آپ کو" وہ جوش سے بولا "دراصل بات یہ ہے کہ جب میں مونا کے پاس ہوتا ہُوں تو میرے دل میں امنا کی آرزو اُبھرتی ہے۔ اُبھرے جاتی ہے۔ اس قدر مسلّط ہو جاتی ہے کہ مونا پُورے طور پر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے، اور اس کی جگہ امنا آ موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح جب میں امنا کے ساتھ ہوتا ہوں تو امنا فیڈ ہو جاتی ہے اور مونا آ موجود ہوتی ہے۔ ڈاکٹر، یہ

اتنا بڑا آپٹیکل الیوژن ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جیسے سراب ہوتا ہے۔ آپ اسے نہیں سمجھ سکتے، ڈاکٹر، نہیں سمجھ سکتے" وہ جوش سے بولا" اس سے بڑی مشکلات پیدا ہوتی ہیں، بڑی مشکلات۔ ذرا سوچیے ڈاکٹر۔ تخلیے میں امنا کے ساتھ ہوتا ہوں تو میرے روبرو مونا ہوتی ہے اور میں یہ بھول جاتا ہوں کہ یہ فریبِ خیال ہے۔ مثلاً امنا کے بال لمبے ہیں، سیدھے ہیں، سنہرے ہیں۔ مونا کے گھنگھریالے ہیں، بھورکالے ہیں، کٹے ہوئے ہیں۔ کئی بار میں امنا سے کہتے کہتے رک جاتا ہوں: ڈارلنگ اب کی بار تمھارا ہیرکٹ بڑا سٹائلش رہا۔"

مجھے راؤ کی مشکل کا احساس ہونے لگا۔ لیکن وہ اپنی ہی دُھن میں بولے جا رہا تھا:

"مثلاً امنا چٹ کپڑی ہے۔ چٹ کپڑی آپ جانتے ہیں، ڈاکٹر؟ اونہوں! آپ نہیں جانتے۔ چٹ کپڑی سے اللہ محفوظ رکھے، ڈاکٹر۔ وہ سفید کپڑے پہنتی ہے۔ بظاہر سادہ، سجاوٹ سے بے نیاز۔ میک اپ سے بے نیاز۔ ویسے میک اَپ ہوتا ہے۔ دکھتا نہیں۔ اہتمام ہوتا ہے۔ لیکن یوں لگتا ہے جیسے سجاوٹ کا شعور ہی نہ ہو۔ معصومیت ہی معصومیت۔ مائی گاڈ!"

اُس نے جھرجھری لی" ڈاکٹر صاحب" وہ بولا" میری بیوی امنا چٹ کپڑی ہے اور مونا رنگیلی ہے رنگ رنگیلی۔ رنگ اس کی کمزوری ہے۔ گالوں پر رنگ، ہونٹوں پہ رنگ، ناخنوں پہ رنگ۔ کپڑے تو رنگ میں یوں ڈوبے ہوتے ہیں جیسے للاری کی دکان ہو۔ اگرچہ ان میں غضب کی ہم رنگی ہوتی ہے۔ یوں رنگ سے رنگ نکلتا ہے جیسے محفل میں بات سے بات نکلتی ہے۔ مونا کو سبز رنگ بہت پیارا ہے۔ ڈاکٹر، ایک روز جب میں امنا کے پاس تھا، لیکن تخیّل میں نیچے سبزے کا فرش بچھا ہوا تھا، میں نے کہا: ڈارلنگ، آج ساون میں پپیہا نہیں بول رہا۔ یہ سُن کر وہ دیر تک خاموش رہی۔ پھر وہ بولی: ہاں، ساون کے اندھے کو ہرا ہی دکھتا ہے۔ اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"اسی طرح ایک روز جب تخلیہ سرسبز تھا، لیکن تخیّل دودھیا تو میں نے کہا: پیاری، تم تو بھور سمے ہو۔ اس پر سبزے کی بساط اُلٹ گئی۔ مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ سامنے مونا کھڑی

ہے۔ مُنھ سُوجا ہُوا، آنکھیں شُعلہ بار۔ بولی: چٹ کپڑی اس حد تک مسلّط ہے؟
"حالانکہ میں بہت احتیاط کرتا ہُوں، ڈاکٹر، لیکن ایسی لغزشیں ہو ہی جاتی ہیں۔ پھر شکوک بھی اُٹھاتے ہیں۔ تخیّل کو قابُو میں رکھنا میرے بس کی بات نہیں ڈاکٹر۔ اکثر شراب سیخ پر اور کباب شیشے میں ٹھونستا رہتا ہُوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کسی روز دونوں بساطیں اُلٹ جائیں گی۔ نہ سبزہ رہے گا نہ بھورسمے ۔ پھر کیا ہو گا، ڈاکٹر؟ میرے لیے تو جینا بھی مُشکل ہو جائے گا۔"
عجیب کیس تھا راحیل راؤ کا!

اب کی بار میں فریدآباد پروفیشنل دورے پہ آیا تھا۔ میری آمد کی اطلاع اخباروں میں چھپ چکی تھی۔ میرے پاس صرف ڈیڑھ ایک گھنٹا تھا۔ اس کے بعد ہی اپوائنٹمنٹس اور مریضوں کے ساتھ سٹنگز۔ مریضوں کے آنے سے پہلے میں تیاری میں مصروف تھا۔ لیکن دقّت یہ تھی کہ پُرانی یادیں پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ راؤ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا، اور اپنی رام کہانی سناتے جا رہا تھا۔
پُرانی یادوں سے جان چھڑانے کے لیے میں باتھ روم میں گُھس گیا، خود کو جھنجھوڑا، مُنھ ہاتھ دھویا، کپڑے بدلے اور باہر نکل آیا۔
عین اس وقت دروازہ کُھلا اور راؤ اندر داخل ہُوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ وہیں دروازے میں رُک گیا، اور بڑے غمناک لہجے میں بولا "ڈاکٹر، دی گیم اِز اوور۔ جس کا مجھے ڈر تھا وہی ہُوا۔"
"کیا ہُوا؟" میں نے پُوچھا۔
"بتانا بےکار ہے، ڈاکٹر۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا، کچھ نہیں۔ دونوں ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔"
"لیکن کیوں؟" میں نے پُوچھا۔

"پردہ اُٹھ گیا۔ بات کھل کر سامنے آگئی۔" یہ کہ کر وہ باہر جانے لگا میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"کچھ تو بتاؤ" میں نے کہا۔

اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ بولا "تقریباً پندرہ دن ہوئے ہیں، میرا برتھ ڈے تھا میں نے دونوں کے لیے تحفے خریدے۔ امنا کے لیے سفید آویزے، ہیرے کے۔ مونا کے لیے سبز زمرد کے۔ لیکن وہی غلطی کر بیٹھا۔ ہیرا مونا کو دے دیا، زمرد امنا کو۔"

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"دفتر گیا تو میز پر مونا کا استعفا پڑا تھا۔ گھر گیا تو امنا کا رقعہ دھرا تھا: میں میکے جا رہی ہوں۔ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔" یہ کہ کر راؤ بولا "ڈاکٹر، اس وقت میری حالت اچھی نہیں میں پھر آؤں گا۔"

راؤ کے جانے کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے چونگا اٹھایا۔ کوئی خاتون بول رہی تھی "ڈاکٹر، میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی آجاؤں کیا؟"

"آجایئے" میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد خاتون کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ بڑی حسین و جمیل عورت تھی۔ اس کا حسن منفرد تھا۔ اس میں شوخی نہیں تھی۔ بے چینی نہیں تھی۔ وہ حسن جو قیام میں پیدا ہوتا ہے، حرکت میں نہیں۔ ہر حرکت کے دوران وہ چند ایک قیام پیدا کرتی۔ جیسے متحرک تصویر میں اچانک ایک سٹل آجائے۔ اس کا ہر قیام پوز پیدا کرتا۔ ایک تصویر بن جاتی۔ نئے قیام۔ انوکھے فریم۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے اپنے ہر قیام کی جاذبیت کا شعور ہو۔ لیکن اس کے انداز میں نمائشی عنصر نہ تھا۔ سادہ، نیچرل، ٹھہراؤ سے بھرپور۔

"تشریف رکھیے" میں نے کیس ہسٹری رجسٹر کھولتے ہوئے کہا۔

وہ بیٹھ گئی۔

"آپ کا نام ؟" میں نے کیس کے کوائف لکھنے کے لیے پوچھا۔

"مسز راؤ" وہ بولی۔

"راؤ !" میں چونکا۔

"راحیل راؤ" وہ بولی۔

میں نے اس کا از سر نو جائزہ لیا۔ اس کے بال لمبے تھے۔ سیدھے تھے۔ اور وہ واقعی چٹ کپڑی تھی۔

"کیا پرابلم ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنے محبوب کی توجہ سے محروم ہو چکی ہوں، ڈاکٹر۔۔۔۔۔"

"کون محبوب ہے، آپ کا ؟"

"میرا شوہر" وہ بولی

"شادی کب ہوئی تھی ؟"

"تقریباً پانچ سال ہوئے۔"

"پہلے توجہ حاصل تھی کیا ؟"

"بہت" وہ بولی "پانچ برس میرے شوہر نے مجھے آنکھوں پر بٹھائے رکھا۔ اتنی توجہ دی کہ کسی مرد نے کسی عورت کو نہ دی ہوگی۔"

"اب کیا کوئی اور عورت ـــــ ؟"

اس نے سرنفی میں ہلا دیا "راؤ کی زندگی میں کوئی اور عورت نہیں آئی ـــ بلکہ ایک عورت جو پہلے اس کی توجہ میں تھی، اب نہیں رہی۔"

"جب وہ تھی تو توجہ آپ پر مرکوز تھی۔ اب وہ نہیں رہی تو آپ توجہ سے محروم ہو گئی ہیں۔ عجیب بات ہے !"

"جی" وہ بولی۔

"اُلٹی سی بات ہے۔"

"بالکل اُلٹی" وہ مسکرائی۔

"جب وہ تھی تو اس کے وجود کا آپ کو علم تھا؟"

"شک سا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا۔"

"کوائف کیا ہیں؟"

"عجیب سے کوائف تھے ڈاکٹر" وہ بولی "سارا دن راؤ مجھے آنکھوں پر بٹھائے رہتے۔ میری ہر حرکت پر یوں حیرت سے میری طرف دیکھتے جیسے مجھ میں کوئی نیا گُن دریافت کیا ہو۔ اکثر مجھ سے کہتے: امنا، یہ پوز جو تم نے ابھی ابھی بنایا تھا، پھر بناؤ نا" وہ مسکرائی۔ کچھ دیر کے لیے رُکی۔ اُس کی آنکھوں میں تارے پھوٹ رہے تھے۔ پھر وہ بولی "جب وہ میرے ساتھ تخلیے میں ہوتے تو رنگ ہی بدل جاتا۔ وہ کھو جاتے۔ حتیٰ کہ انھیں شعور ہی نہ رہتا کہ وہ میرے پاس ہیں۔ اس قدر بیگانہ ہو جاتے جیسے جیسے۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔

"عجیب سا کیس ہے!" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر" وہ بولی "میرے لیے محبت ایک ماحول ہے، توجہ بھرا ماحول۔ ایک ساتھ ہے۔ قُرب ہے۔ لیکن اس میں تخلیہ اہم نہیں۔ تخلیے کی آرزو نہیں۔ صرف گوارا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں" میں نے کہا "کیا آپ کے شوہر کے لیے تخلیہ اہم ہے؟"

"ہاں" وہ سوچ کر بولی "خاصا اہم ہے۔"

"کیا اسی وجہ سے آپ کے خاوند نے دُوسری خاتون سے تعلقات پیدا کیے تھے؟ میرا مطلب ہے، شاید انھوں نے سوچا ہو کہ توجہ آپ کی، تخلیہ اُس کا۔"

"شاید" وہ مسکرائی "وہ عورت یقیناً تخلیہ پسند تھی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہُوا کہ راؤ کے تعلقات ایک اور خاتون سے بھی ہیں؟"

"مجھے ڈاکٹر شوکت نے بتایا تھا۔ دراصل میرے شوہر سے ایک ایسی بات سرزد ہو گئی جس

سے میرا شک بہت تقویت پکڑ گیا اور میں اُس سے روٹھ کر ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ ایک رُقعہ چھوڑ آئی۔ لکھا تھا: مجھے پتا چل گیا ہے۔ میں واپس نہیں آؤں گی۔ آپ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کریں۔"

"اس کے بعد راؤ نے ڈاکٹر شوکت کو سب کچھ بتا دیا؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر شوکت مجھ سے ملے۔ انھوں نے راؤ کا بھید مجھے بتا دیا اور کہا کہ راؤ کی حالت اچھی نہیں۔ وہ تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ممکن ہے خودکشی کی کوشش کرے۔ یہ سُن کر میں ڈر گئی اور واپس آگئی۔ چونکہ مجھے راؤ سے بے پناہ محبت ہے، میرے لیے ان سے دُور رہنا بے حد مشکل ہے۔ ڈاکٹر میں یہاں آئی تو پتا چلا کہ راؤ کی سیکرٹری بھی استعفادے کر جا چکی ہے۔"

"اس بات پر آپ کو بہت خوشی ہوئی ہو گی؟"

"بالکل نہیں، ڈاکٹر" وہ بولی "بالکل نہیں۔ اُلٹا میں سخت گھبرا گئی۔ راؤ کا بھید جاننے کے بعد میں مونا کی اہمیت کو پورے طور پر سمجھ چکی تھی۔"

"راؤ کا کیا بھید تھا؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ جھینپ گئی۔ چند ایک ساعت بعد بولی "جب راؤ خلیے میں پاس ہوتے تو وہ تخیّل میں سمجھتے کہ مونا کے پاس ہیں۔ جب مونا کے پاس ہوتے تو تخیّل میں مجھے دیکھتے ۔۔ یہ جان کر میں نے سمجھا کہ مونا کا ہونا سخت ضروری ہے۔ میں نے مونا کو ڈھونڈنے کی کوشش شروع کی۔ سارا گلبرگ چھان مارا۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ مونا کے چلے جانے کے بعد راؤ کے تخیّل میں مونا ہی مونا رہ گئی تھی۔ میں معدوم ہو چکی تھی۔ اس لیے خود کو پھر سے قائم کرنے کے لیے مونا کو واپس لانا ضروری تھا۔"

"تو کیا مونا مل گئی؟"

"ہاں، مل گئی۔ گلبرگ کے ایک ایسے گھر سے ملی جس کی ریپوٹیشن اچھی نہ تھی۔ میں نے

بڑی مشکل سے اسے واپس آنے پر رضامند کر لیا۔ لیکن بدقسمتی سے جب وہ کار میں یہاں آ رہی تھی تو ایکسیڈنٹ ہو گیا، اور وہ جانبر نہ ہو سکی۔"

"کیا راڈ کو اس کا علم ہے؟"

"ہاں، علم ہے" وہ بولی "لیکن اس کے باوجود مونا اس کے تخیّل پر سوار ہے۔ وہ مر کر راڈ کے تخیّل پر چھا چکی ہے اور میں ان کی توجّہ سے معدوم ہو چکی ہوں، محروم ہو چکی ہوں۔"

"ہوں" میں نے کہا "لیکن اب آپ چاہتی کیا ہیں؟"

"میں جینا چاہتی ہوں، ڈاکٹر۔ ان کی توجّہ میرے لیے زندگی ہے" وہ بولی "راڈ کی توجّہ کے بغیر میں جی نہیں سکتی۔ کیا آپ راڈ کا علاج کریں گے؟ ان کی توجّہ لوٹ آئے ہم سٹنگز کے لیے لاہور آ جائیں گے۔" کچھ دیر وہ میری طرف دیکھتی رہی۔

"اس کی ضرورت نہیں" میں نے کہا۔

"کیا آپ کچھ نہیں کر سکتے؟" اس نے حسرت بھرے انداز میں مجھ سے اپیل کی۔

"میں نہیں، آپ کر سکتی ہیں" میں نے جواب دیا۔

"میں؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں، آپ" میں نے جواب دیا "راڈ کے لیے آپ ایک نئی سیکرٹری نہیں ڈھونڈ سکتیں کیا؟"

"نئی سیکرٹری؟" اس نے دُہرایا۔

"جو تخلیے کی شوقین ہو" میں نے کہا "گلبرگ کے اسی گھر کی کوئی لڑکی جہاں مونا ملی تھی۔ راڈ کی توجّہ حاصل کرنے کے لیے یہی ایک طریقہ ہے۔"

"کوئی ایک مونا؟" وہ چیخی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا "ہاں، کوئی ایک مونا۔"

وہ ایک جاذب نگاہ پوز میں کھڑی تھی۔ چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں مدھ بھری پھوار اُڑ رہی تھی!

چکٹ گاڑی، ہونکتا ہوٹر اور موم بتی

لاحول ولا قوۃ۔ کتنی بے معنی خبر ہے۔ میں نے غصے میں اخبار اُٹھا کر پرے پھینک دیا۔ بھلا ماننے کی بات ہے کیا کہ کہانی اس قدر پُر اثر ہو کہ سُننے والوں کو فساد پر آمادہ کر دے۔ میں نہیں مانتا۔ میں نے چلا کر کہا۔

ایسے ہی من گھڑت خبریں چھاپ دیتے ہیں۔ بھئی میں خود کہانیاں لکھتا ہوں۔ ساری زندگی اسی دھندے میں گزاری ہے۔ ادبی انجمنیں شاہد ہیں کہ میری کوئی کہانی کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ ایمان سے، لوگ سنتے ہیں، ادھے ادھے کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھار انجانے میں واہ بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ہوش میں آ کر تنقید کی چمٹیاں، قینچیاں، چھریاں نکال لیتے ہیں اور پھر چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں، کہانی کو کم، لکھنے والے کو زیادہ۔

اس روز صبح سویرے سے میں اخبار لیے بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے یہی خبر نظر آئی تھی کہ مزدور شٹل میں کسی بڑے میاں نے ایک کہانی سُنائی جسے سن کر سبھی مشتعل ہو گئے۔ فساد برپا ہو گیا۔ دو مارے گئے، پانچ زخمی ہو گئے۔ آپ کہیں گے اتنی غیر اہم خبر میری نگاہ پر کیسے چڑھی۔ آپ سے کہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میں صرف غیر اہم خبریں پڑھا کرتا ہوں۔ اخبار پڑھنا بھی مجھے میرے دوست ابنِ انشا نے سکھایا تھا۔ کہنے لگا "مفتی، سچی اور عوامی خبریں پڑھنا چاہتے ہو تو غیر اہم خبریں پڑھو۔ اس لیے اخبار کو اُلٹی طرف سے کھولو جہاں غیر اہم خبریں ہوتی ہیں۔ اہم خبریں کبھی سچی نہیں ہوتیں۔ جن مسائل سے بڑوں کی غرض و غایت وابستہ ہو، نہ وہ سچی ہو سکتی ہیں نہ عوامی۔ لہٰذا عوام سے متعلق خبریں پڑھو جو اخبار میں غیر اہم صفحات پر ڈھیر کر دی جاتی ہیں۔ مثلاً فلاں

خاتون کے گھر دو سروں والا بچہ پیدا ہُوا۔ فلاں گھر میں جنّات کی خشت باری ابھی تک جاری ہے۔ راہ چلتے نوجوان نے خاتون کو آنکھ ماری اور پکڑا گیا۔ ایسی خبریں۔"

اس روز اخبار میں خبر پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ ممکن ہے یہ دُرست ہو۔ بھلا غیر سیاسی خبر میں جھُوٹ ملانے کی کیا ضرُورت تھی۔ جوں جوں میں سوچتا گیا توں توں شکوک پیدا ہوتے گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کہانی اس قدر پُر اثر ہو کہ فساد پر آمادہ کردے۔

پھر خیال آتا، آخر ادبی محفل میں بھی تو کہانی سُننے والے آستین چڑھا کر بات کرتے ہیں اور میز پر مکّے مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے تو خبر درست ہو سکتی ہے۔ پھر خیال آتا، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ادبی محفل میں تو پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر کسی نے تنقید پر کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ رکھی ہوتی ہے، لہٰذا وہ اپنے علم کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور علم کا مظاہرہ دُوسرے کی بات رد کرنے میں ہی ہوتا ہے، سپورٹ کرنے میں نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ادبی محفل کا ہال واحد جگہ ہے جہاں ادیب کو کھُل کر بات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ باہر سیاستیے بولنے نہیں دیتے، گھر میں بیوی۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ معترض کا مقصد کہانی پر بات کرنا نہیں ہوتا بلکہ اپنی ادبی صلاحیتیں جھانٹنا ہوتا ہے۔ مزدُور نقاد تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ وہ ایک معصوم سی کہانی پر کیسے مشتعل ہو سکتے ہیں!

"خبر من گھڑت ہے" میں نے چیخ کر کہا اور غصّے میں اخبار کو پھینک دیا۔ عین اس وقت سجّاد آ گیا۔ سجّاد میرا دوست ہے۔ یقیناً آپ اسے جانتے ہوں گے۔ بھئی، مشہور جرنلسٹ ہے۔

وہ آتے ہی بولا "کونسی خبر من گھڑت ہے؟"

"خبر ہے کہ چلتی گاڑی میں ایک مزدور نے ایک کہانی سُنائی جسے سُن کر لوگ اس قدر مشتعل ہو گئے کہ فساد برپا ہو گیا۔ دو مارے گئے، پانچ زخمی ہو گئے" میں نے جواب دیا" لیکن میں نہیں مانتا کہ کوئی کہانی اس قدر پُر اثر ہو سکتی ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" وہ بولا۔

"بھئی، میں خود افسانہ نویس ہُوں۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" سجاد تن کر کھڑا ہو گیا۔

"بھئی، ایک کہانی کی وجہ سے اتنا بڑا فساد ہو جائے! بات سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ ایک صورت ہے، اگر کہانی ذاتی نوعیت کی ہو تو پھر ہو سکتا ہے کہ سننے والے کو غصہ آ گیا ہو۔"

سجاد نے نفی میں سر ہلایا۔ بولا "یہ کہانی ذاتی نوعیت کی نہیں تھی۔"

"تمہیں پتا ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، پتا ہے" اس نے جواب دیا۔

"کیسی کہانی تھی وہ؟" میں نے اسے کریدا۔

"عام سی تھی، جیسے فیبلز ہوتی ہیں۔ مثلاً چڑی کاں کی کہانی۔"

"نہیں یار، مذاق نہ کر" میں ہنس پڑا "اوّل تو کہانی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ فساد برپا کر سکے، پھر چڑی کاں جیسی کہانی۔ اونہوں! یہ خبر سرے سے ہی غلط معلوم پڑتی ہے۔"

"خبر تو بھئی سولہ آنے مصدقہ ہے" سجاد نے تن کر کہا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ مصدقہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی، میں خود وہاں موجود تھا" سجاد نے جواب دیا۔

"موقع پر؟"

"ہاں، موقع پر۔"

"تم نے وہ کہانی خود سنی تھی کیا؟"

"بالکل بھئی، میں کہانی سنانے والے کے قریب کھڑا تھا۔"

"تو یار مجھے سناؤ وہ کہانی" میں نے پینترا بدلا۔

"بھئی، وہ ایک عام سی کہانی تھی، جیسے ہوتی ہیں پرانی کہانیاں۔ اور سنانے والا ایک عام سا آدمی تھا۔ ایک معتبر مزدور۔ اور کہانی سنانے سے اس کا کوئی خاص مقصد نہ تھا۔"

"تو پھر اس نے کہانی سنائی کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یار، بڑے بوڑھوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں بیٹھتے ہیں کوئی اصلاحی بات یا نصیحت چھیڑ دیتے ہیں۔ اور پھر اس کی سپورٹ میں کوئی فوک وزڈم کی کہانی سنا دیتے ہیں یا سعدی کی یا مولانا روم کی کوئی حکایت۔ بہر حال، وہ اپنی نوعیت کی کہانی تھی" سجاد نے کہا۔

"تم سنا دو تو سہی" میں نے اس کی منت کی۔

سجاد کرسی پر بیٹھ گیا، جیب سے سگریٹ نکالا، سلگایا، ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑا۔ پھر جیسے کہانی سنانے کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ لیکن جلد ہی پھر ہچکچا کر بولا "اس وقت وہ کہانی شاید پھسپھسی لگے۔ دراصل کہانی کا ماحول سے گہرا تعلق تھا۔"

"تو ماحول بھی بیان کر دو۔ اس میں کیا مشکل ہے؟" میں نے کہا۔

کچھ دیر کے لیے سجاد سوچتا رہا۔ پھر بولا "تم فیکٹری شٹل کو جانتے ہو کیا جس میں یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا؟"

"بھئی، ظاہر ہے وہ کوئی گاڑی ہو گی" میں نے جواب دیا۔

"گاڑی تو ہے" سجاد بولا "لیکن ایک خصوصی گاڑی ہے۔ یہ گاڑی روز صبح شہر سے مزدوروں کو لاد کر تاربین آئل فیکٹری تک پہنچاتی ہے اور شام کو فیکٹری سے انھیں لاد کر شہر لے آتی ہے۔ یہ فاصلہ تقریباً چالیس میل کا ہے۔ اس لائن پر کوئی سٹیشن نہیں۔ صرف فلیگ سٹاپ ہیں۔ جب یہ شٹل شہر پہنچتی ہے تو اسے باقاعدہ پلیٹ فارم پر نہیں لاتے بلکہ سٹیشن سے باہر سائیڈنگ پر کھڑا کر دیتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی اس لیے کہ یہ گاڑی اس قابل نہیں کہ اسے منظرِ عام پر لایا جائے" سجاد نے جواب دیا "دراصل یہ گاڑی نہیں تیلی کی دکان ہے۔ کل کوئی چھ بوگیاں ہوں گی۔ سب تیل سے چکٹ۔ سیٹیں، فرش، پہیئے، پائدان سب کالے دھت۔ نہ تو بوگیوں میں دروازوں کے پٹ ہیں نہ کھڑکیوں کے شٹر۔ سامان رکھنے کے تختے بھی اکھاڑ لیے گئے ہیں۔ کھڑکیوں کو

بند کرنے والے شیشے اور تختے ٹوٹ چکے ہیں۔ باتھ روم کے دروازے بھی غائب ہیں۔ ان بوگیوں میں نہ بتیاں ہیں نہ پنکھے۔ صرف یہی نہیں، بوگیوں کا ہر پیچ ڈھیلا ہے۔ پہیتے چلنے کے ساتھ جھولتے جھومتے بھی ہیں۔ ایک گاڑی کو دوسری گاڑی سے جوڑنے والے کنڈے تو ہیں مگر بغرز کے شاک آبزار برز کب کے دم توڑ چکے ہیں۔ چلتے ہوئے دھکے لگتے ہیں اور ساتھ عجیب و غریب قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ یوں جیسے پُراسرار فلم میں بیک گراؤنڈ میوزک چل رہی ہو" سجاد ہنسنے لگا "وہ گاڑی نہیں اُونٹ ہے۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ البتہ ایک ہوٹر ہے جو بہت جاندار ہے۔ نہایت بھدّی اور ڈراؤنی آواز میں بجتا ہے۔ اور تقریباً سارا راستہ بجتا ہی رہتا ہے۔"
کچھ دیر کے لیے وہ رُک گیا۔

"ہوا یُوں کہ چار ایک دن پہلے تاربین آئل فیکٹری کے متعلق ایک خبر چھپی تھی کہ بیروزہ کے پھوگ سے ہم ایک ایسی چیز بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو عوام کی زندگی پر گہرا اثر مرتّب کرے گی۔" وہ پھر رُک گیا۔

"اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا، بھئی، یہ کیا چیز ہے جو عوام کی زندگی پر گہرا اثر مرتّب کرے گی؟ اس کی تفصیلات کا پتہ لگاؤ۔ اور اگر واقعی یہ چیز اہم ہے تو اس پر ایک فیچر لکھ دو۔ اس پر میں نے فیکٹری کے پی آر کو فون کر کے پُوچھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ وہ بولا، چیز بتانے کی نہیں، دیکھنے کی ہے۔ یہاں آ جاؤ۔ اسی وجہ سے مجھے کل تاربین آئل فیکٹری جانا پڑا۔ وہاں دِن بھر ریسرچ میں مصروف رہا۔ پھر شام کو اسی گاڑی سے لوٹا جس میں یہ حادثہ پیش آیا۔" سجاد خاموش ہو گیا۔ پھر بولا "چائے پلاؤ گے؟"

میں نے چڑ کر کہا "پہلے ساری بات بتا مجھے، پھر پلاؤں گا۔"

وہ ہنسنے لگا، سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا۔ بولا "واپسی پر جب میں سٹاپ پر پہنچا تو گاڑی حرکت میں آ چکی تھی۔ خیر، میں دوڑ کر سوار ہو گیا۔ اُس وقت سُورج غروب ہو رہا تھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گاڑی مزدوروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ دراصل اس روزان کا پے ڈے تھا۔

اس لیے حاضری فل تھی۔ گاڑی میں تیل، پسینے اور فکرمندی کی بُو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے ۔ وہ سب گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔ ہر کوئی اپنی ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ ایک دوسرے سے کوسوں دُور۔ نہ جانے کہاں؟"

" تُو تو کہتا ہے، وہ پے ڈے تھا" میں نے اُسے ٹوکا۔

"بالکل، پے ڈے تھا" سجاد نے جواب دیا۔

"مزدُور تو پے ڈے پر خوش ہوتے ہیں" میں نے کہا۔

"یہ غلط فہمی عام ہے" سجاد بولا "مہینے بھر مزدور لوگ پے حاصل کرنے کی اُمّید رچائے رکھتے ہیں۔ خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ پے ڈے کو انھیں احساس ہوتا ہے کہ حصول کتنا عبث ہے۔ کتنا بے معنی۔ کتنی عجیب بات ہے" سجاد مُسکرایا "کہ زندگی کا المیہ حاصل نہ ہوتے میں نہیں بلکہ حاصل ہو جانے کے بعد اس احساس میں ہے کہ کیا اسی کے لیے اتنی شور اشوری تھی۔ نٹشے کہتا ہے کہ ہماری زندگی کا عظیم ترین لمحہ وہ ہے جب ہماری بڑی سے بڑی آرزو، بڑی سے بڑی کامیابی ہماری نگاہ میں ہیچ نظر آتی ہے۔"

"ہٹا یار" میں نے چڑ کر کہا "نٹشے بازی چھوڑ۔ مجھے وہ کہانی سُنا۔"

وہ میری بے قراری پر ہنسنے لگا "ایک معمولی سی کہانی کے لیے تم خود کو رسّی کی طرح بل دے رہے ہو" یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور بات شروع کی۔ بولا "اتفاق سے مجھے کھڑے ہونے کے لیے وہیں جگہ ملی جہاں وہ بڈّھا مزدور داستان گو بیٹھا تھا۔ ایک دُبلا پتلا مزدُور میرے پاس کھڑا تھا۔ بولا: میاں جی، آپ کہانی سُنانے لگے تھے۔ ہاں، ہاں، بڈھا بولا یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب غلام رکھنے کی رسم عام تھی۔ بازار میں ہر اٹھوارے منڈی لگا کرتی تھی جس میں غلام کھلّم کھلّا بکتے تھے۔ سوداگر بکنے والے کو تھڑے پر کھڑا کر کے اس کی خوبیاں گنواتے کہ دیکھ لو مضبوط آدمی ہے، جوان ہے، طاقت ور ہے، کام کر سکتا ہے، بے داغ ہے۔ جس طرح گھوڑے کو بیچتے وقت اس کے دانت دکھاتے ہیں۔ پھر بولی شروع ہو جاتی۔ جو سب

اُونچی بولی دیتا، غُلام ہمیشہ کے لیے اس کی ملکیّت ہو جاتا اور مالک اس سے زندگی بھر جو کام چاہتا، لیتا۔

"گاڑی چیختی چلاتی کراہتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ گرد و پیش کا ویران علاقہ دھندلا ہو چکا تھا۔ رات کا اندھیرا ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ گاڑی کے اندر فکرمندی اور اُداسی کے انبار لگے ہُوئے تھے۔ مزدوروں کی شکلیں دُھندلائے جا رہی تھیں۔ مُوٹر اپنی بھدّی آواز میں کراہ رہا تھا۔

"کچھ دیر کے بعد میاں جی بولے: پھر جو بندے کو غُلام بنانے کے خلاف آوازے لگنے لگے تو ملک کے قانون میں بدلی کر دی گئی۔ ملک میں ڈھنڈورہ پیٹ کر اعلان کر دیا گیا کہ جس طرح مالک کو حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اپنے غلام کو منڈی میں لا کر بیچ سکتا ہے، اس طرح آیندہ سے غُلام کو بھی حق حاصل ہو گا کہ وہ جب چاہے خود کو بکنے کے لیے پیش کر دے۔ مطلب یہ کہ جس غلام کو اپنا آقا پسند نہ ہو وہ شہر کے قاضی کے پاس جائے۔ اگر قاضی اسے بکنے کی اجازت دے دے تو منڈی میں خود کو بکنے کے لیے پیش کر دے۔ بولی میں جو قیمت ملے وہ اپنے پہلے مالک کو دے دے اور خود کو نئے مالک کے حوالے کر دے۔ میاں جی پھر خاموش ہو گئے۔

"گاڑی میں بیٹھے ہوئے مزدُور جُوں کے توُں چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایسا معلُوم ہوتا تھا جیسے کوئی کہانی نہیں سُن رہا تھا۔ ہر کوئی اپنی ہی سوچ میں کھویا ہُوا تھا۔ صرف وہی دُبلا پتلا مزدُور ہُنکارا بھر رہا تھا: جی میاں جی پھر؟

"میاں جی نے سر اُٹھا، ایک لمبی آہ بھری اور بولے: شہر میں ایک غلام تھا، زبیر۔ نوجوانی کا عالم تھا۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔ جسم میں جان تھی۔ ناک نقشے میں جاذبیت تھی۔ وہ ہر چھٹے دن شور مچا دیتا: میں بکوں گا۔ میں اس مالک کے پاس نہیں رہوں گا۔ اس مالک میں کیا عیب ہے جو تو اس کے پاس نہیں رہے گا؟ قاضی نے پُوچھا۔ زبیر بولا: جناب، یہ مالک مُجھ سے اچھا برتاؤ نہیں کرتا۔ میں سارا دن اس کے کاموں میں جُتا رہتا ہُوں، لیکن یہ خود تو تازی روٹی کھاتا ہے اور مجھے کھانے کو باسی دیتا ہے۔ قاضی نے زبیر کو بہُت سمجھایا بجھایا کہ اتنی سی بات کو

دل پر نہیں لگاتے لیکن زبیر نہ مانا۔ قاضی نے اسے بکنے کی اجازت دے دی اور وہ پھر سے بک گیا۔

"اپنے نئے مالک کے گھر چند ہی روز رہنے کے بعد زُبیر نے پھر شور مچادیا: میں بکوں گا، میں بکوں گا۔ میں اس مالک کے پاس نہیں رہوں گا۔ اس نے کہا کہ یہ خود گیہوں کی کھاتا ہے اور مجھے جَو کی دیتا ہے۔ قاضی نے پھر اسے بہت سمجھایا بجھایا مگر وہ نہ مانا اور پھر بک گیا۔

"تیسرے مالک کے گھر پہنچتے ہی زبیر نے پھر سے چیخ پُکار شروع کر دی کہ اس سے بہتر تو میرا پہلا مالک ہی تھا جو اگرچہ جَو کی دیتا تھا لیکن دو وقت تو دیتا تھا۔ یہ تو صرف ایک وقت روٹی دیتا ہے اور وہ بھی روٹی نہیں بلکہ پانی میں بھگوئے ہُوئے سُوکھے ٹکڑے۔ یہ مجھے انسان نہیں، جانور سمجھتا ہے۔ میں اس کے پاس نہیں رہوں گا۔ قاضی بولا: زبیر، میں نے تجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ مالک ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب میں تجھے کیا سمجھاؤں۔

گاڑی کے ہُوٹر نے زور سے لمبی چیخ ماری۔ بُوڑھا رُک گیا۔

"گاڑی ہونک رہی تھی، یُوں جیسے سسکیاں بھر رہی ہو۔ کل پُرزے کڑکڑا رہے تھے۔ انجن یُوں چیخ رہا تھا جیسے چلّا چلّا کر کہہ رہا ہو: بکوں گا، میں بکوں گا۔ گاڑی کے اندر خاموشی کا تنبو تنا ہُوا تھا۔ گھُپ اندھیرے میں سے دبی دبی آہوں کراہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"پھر میاں جی، دُبلے پتلے واحد سامع کی آواز سُنائی دی، پھر کیا ہُوا؟ میاں جی بولے: زبیر کی آوازیں آتی رہیں، آتی رہیں: میں بکوں گا، میں بِکوں گا۔ پہلے ان آوازوں میں غصّے کا رنگ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ان میں دُکھ کا پہلُو اُبھرتا گیا۔ پُکاریں کراہوں میں بدلتی گئیں، اور وہ بکتا گیا بکتا گیا۔ پھر دفعتہً اس کی آواز خاموش ہوگئی۔ زبیر چُپ ہوگیا۔ زبیر کو یُوں چُپ دیکھ کر لوگ چونکے: یہ کیا ہُوا؟ زبیر چُپ کیوں ہوگیا؟

"سارے مزدوروں اور غلاموں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک بولا: زبیر کو آخر کار آقا مل گیا ہے۔ وہ خوشی کی وجہ سے چُپ ہو گیا ہے۔ دوسرے نے کہا: چلو، مان لیا کہ وہ خُوش ہے۔ پھر وہ خوش دِکھتا کیوں نہیں؟ پہلے اس کا چہرہ کتنا صاف تھا۔ اس پر بشاشت کی جھلک

تھی۔ مگر اب ماتھے پر تیوری چڑھ بیٹھی ہے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں۔

"ایک بُوڑھے غلام نے کہا: وہ اس لیے چُپ ہو گیا ہے کہ اب وہ جان گیا ہے۔

"اس کے بعد جب بھی زُبیر بازار میں نکلتا تو لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں: دیکھو دیکھو، وہ قاضی کی طرف جا رہا ہے۔ ضرور وہ بِکنا چاہتا ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتے کہ اس کا رُخ کسی اور طرف ہے تو وہ مایوس ہو جاتے۔ پھر وہ آوازے کستے: زبیر، تو قاضی کے پاس کیوں نہیں جاتا؟ کیا تو بِکنا نہیں چاہتا؟ کیا تو خُوش ہے؟ لیکن زُبیر ان آوازوں کو اَن سُنی کر کے گردن جھکائے چلا جاتا۔

"لوگوں کی آپس میں شرطیں بدھ گئیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ زُبیر خُوش ہے، کچھ کہتے تھے وہ خوش نہیں۔ شرط پر فیصلہ سُننے کے لیے لوگوں نے اپنے آوازے تیز تر کر دیے۔ آخر ایک روز ان آوازوں سے اُکتا کر زُبیر رُک گیا۔ اس نے مُنھ موڑ کر آوازہ لگانے والے کی طرف دیکھا اور چلا کر بولا: میں نہیں بِکوں گا۔ میں نہیں بِکوں گا۔ میں خُوش ہُوں۔ بہُت خُوش۔ آوازے لگانے والوں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ابھی زُبیر نے جانے کے لیے رُخ بدلا ہی تھا کہ مجمعے سے ایک آواز آئی: تو کیوں نہیں بِکے گا؟ وجہ؟

"زُبیر پھر رُک گیا۔ بولا: میرا آقا علم کا رسیا ہے۔ مطالعے کا شوقین ہے۔ مگر اتنا کنجوس ہے کہ چراغ دان نہیں خریدتا۔ رات کو جب وہ مطالعہ کرتا ہے تو چراغ میری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ یُوں میں آدھی آدھی رات تک چراغ اُٹھائے رہتا ہُوں۔ نہیں، میں نہیں بِکوں گا۔ وہ چیخ کر بولا: میں ڈرتا ہُوں کہ میرا اگلا مالک مجھے تیل پلا دے گا اور میرے مُنھ سے بتّی نکال کر مُجھے دِیا بنائے گا۔ نہیں، میں نہیں بِکوں گا۔ میں نہیں بِکوں گا۔

"بُڈھا خاموش ہو گیا۔ گاڑی پر سکوت طاری ہو گیا۔ اندھیرا اس قدر گاڑھا تھا کہ محسُوس ہُوا جیسے کسی نے ہمیں کنوئیں میں دھکّا دے دیا ہو۔ سانس لینا مُشکل ہو رہا تھا۔ یونہی صدیاں بیت گئیں۔ پھر دفعتہً گاڑی کا ہوٹر کراہنے لگا: میں نہیں بِکوں گا۔ میں نہیں بِکوں گا۔

اس پر گاڑی میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ ایک آواز آئی: میاں جی، تو مجھے طعنہ دے رہا ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ پھر ایک مزدور کھڑا ہو گیا۔ بولا: یہ تجھے طعنے نہیں دے رہا، عبداللہ، میرا مذاق اُڑا رہا ہے۔ مجھے پتا ہے۔ اس کی آواز میں تشدّد تھا۔

"نہیں، نہیں، پتلا دُبلا مزدور بولا: میاں جی تو کہانی سُنا رہے تھے۔ ٹھہر جا تو۔ تشدّد بھری آواز پھر آئی: میں اس بڈھے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اسے سمجھ لوں گا۔

"پھر اس ہنگامے سے ایک دھونس سُنائی دی اور ایک اُونچا لمبا آدمی چھلانگ لگا کر کونے سے باہر نکل آیا۔ تو رہنے دے، لمبا تڑنگا بولا، اس بڈھے نے تجھے نہیں، مجھے چھیڑا ہے، مجھے۔ میرا نام زُبیر ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میں کیوں بکنا نہیں چاہتا۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ جس نے اس کی حمایت کی، اس سے میں سمجھ لوں گا۔

"پھر بوگی میں چاروں طرف سے تشدّد بھری آوازیں آنے لگیں" سجّاد نے کہا "یہ عالم دیکھ کر میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ گاڑی کے پہیے ہونک رہے تھے۔ بفر ٹکرا ٹکرا کر دھکّے دے رہے تھے۔ بوڑھا چلّا رہا تھا: میں نہیں بکوں گا، میں نہیں بکوں گا۔"

سجّاد خاموش ہو گیا ــــ دیر تک خاموش بیٹھا رہا، جیسے گہری سوچ میں پڑا ہو۔ پھر اُس نے ایک لمبی آہ بھری "سچّی بات یہ ہے، مفتی" وہ بولا "میرا جی چاہتا تھا کہ بڑھ کر اس بڈھے کی ناک پر گھونسا ماردوں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں" سجّاد ہنسا "مجھے ایسے لگا جیسے اس بڈھے نے میرا راز مجھ پر کھول دیا ہو۔ پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا جیسے میرے ایڈیٹر نے مجھے موم بتّی بنا کر دونوں سروں پر جلا رکھا ہو تاکہ اس کا اپنا نام روشن رہے۔"

ایک ہاتھ کی تالی

چلتے چلتے میں رُک گیا: ہائیں! یہ کیا؟

میرے سامنے چھوٹی چار دیواری کے درمیان ایک درخت کھڑا تھا جس کی شاخیں ایک جانب کیکر کی تھیں اور دُوسری جانب بیری کی۔

میں نے حیرت سے اس کا جائزہ لیا۔ بظاہر تنا ایک ہی تھا۔ قریب سے دیکھنے کے لیے میں چار دیواری کے اندر داخل ہو گیا۔

چار دیواری کے اندر کُھلی زمین تھی، جس میں دو پُختہ قبریں بنی ہُوئی تھیں۔ دونوں قبروں کے درمیان میں وہ درخت استادہ تھا۔ میں نے درخت کے گرد گھوم پھر کر دیکھا۔ وہ ایک ہی درخت تھا، لیکن اُوپر دائیں ہاتھ کی ٹہنیاں کیکر کی تھیں اور بائیں ہاتھ کی بیری کی۔ کیکر کی ٹہنیوں پر جا بجا زرد رنگ کی ٹلیاں بندھی ہوئی تھیں، اور بیری کی ٹہنیوں پر لال رنگ کی۔ میں حیرت سے بُت بنا اُسے دیکھتا رہا۔

دفعتہً چار دیواری کے قریب حرکت سی ہُوئی۔ میں چونکا۔ دیکھا ایک بُوڑھی ضعیف عورت گٹھڑی بنی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے۔ مجھے متوجہ دیکھ کر وہ کانپتی ہُوئی آواز میں بولی "کیا دیکھ رہا ہے تُو؟"

میں نے کہا "مائی جی، اس درخت کو دیکھ رہا ہُوں۔ عجب درخت ہے یہ۔ آدھا کیکر، آدھا بیری۔"

بڑھیا مُسکرائی، بولی "یہ اِن بابا لوگوں کا معجزہ ہے۔"

"کون بابا لوگ ؟" میں نے پُوچھا۔

اس نے ہاتھ ہلا کر دونوں قبروں کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن مُنھ سے کچھ نہ کہا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان قبروں کو دیکھتی رہی۔ عین اس وقت ایک عمر رسیدہ آدمی داخل ہُوا۔ بولا "یہ دائیں ہاتھ والا باباکمال کا مزار ہے، اور بائیں ہاتھ والا باباجمال کا۔ یہ دونوں عشق و محبت کے بابے ہیں، بابوجی۔ یہاں محبت کے مارے لوگ آتے ہیں، منّتیں مانتے ہیں۔ ٹہنیوں پر جو ٹلیاں بندھی ہُوئی ہیں، یہ سب محبت کی منّتیں ہیں۔ باباکمال کے دوار پر عورتیں آتی ہیں اور پیلی ٹلّی باندھتی ہیں۔ باباجمال کی خدمت میں مرد آتے ہیں اور لال ٹلّی باندھتے ہیں۔"

مجھے بابوں والوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ ہی میں منّتیں ماننے کو اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن وہ آدھا کیکر، آدھا بیری کا درخت!—— میں تحقیق پہ مجبور ہو گیا —— ورنہ یہ کہانی اَن کہی رہ جاتی۔

سردار بائی باہر میں نہیں بھیتر میں جیتی تھی۔ اس کی ہر بات میں رمز ہوتی۔ بھید اُچھلتا ضرور تھا، پر ہونٹوں پر نہیں آتا تھا۔ گالوں پر سُرخی بن کر جھلکتا۔ آنکھوں میں پھوار بن کر اُڑتا۔ لیکن کیا مجال کہ زبان میں جنبش پیدا کرے۔

ایک روز جب چاروں ناچیاں فراغت سے بیٹھی تھیں تو سردار بائی نے برسبیلِ تذکرہ کہا "لڑکیو، ہم یہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

یہ سُن کر تینوں چونکیں۔

بینی کی بھویں کمان بن گئیں۔ ماتھے پر وہ مخصوص گھوری پڑ گئی جو گھورتی بھی تھی، ساتھ پچکارتی بھی۔ بینی بولی "کیا کہا؟ یہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں؟"

سردار بائی نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

چمکی کی ناک دھار بن گئی۔ آنکھوں میں پھرکی سی چلی۔ بولی "کیوں جا رہے ہیں ہم؟"

سردار بائی کی آنکھوں میں تبسم کی پھوار اڑی، لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

مینا چونکی۔ پھر خود کو سنبھال کر بولی "کہاں جا رہے ہیں ہم؟"

سردار بائی کی آنکھوں میں پھر سے پھلجھڑی چلی، لیکن خاموشی چھائی رہی۔

لڑکیوں کو پتا تھا کہ جب سردار بائی کی آنکھوں میں پھلجھڑی چلے تو سمجھ لو کہ کوئی بات ہے۔ ضرور ہے۔ پر وہ بھید ہے۔ زبان پر نہیں آئے گی۔ لاکھ پوچھو، کریدو ـــ بے کار۔

ایک ہفتے کے بعد جب ان کا ڈیرہ دور کسی ریاست کے صدر مقام انگولا میں پہنچا تو انھیں پتا چلا کہ یہاں قیام ہوگا۔ "کہاں" کا جواب تو مل گیا۔ "کیوں" بھید ہی رہا۔

نئی رہائش گاہ دیکھی تو وہ حیران رہ گئیں۔ وہ چوبارہ نہیں تھی بنگلہ تھی۔ تھی تو رقص و سرود کے علاقے میں، پر ذرا ہٹ کر، ایک طرف۔ بنگلے کے دروازے پر "آسا دری" کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

چوبارے کی شو ونڈو سے نکل کر بنگلے کی چار دیواری میں آگئیں تو انھیں وقار مل گیا۔ سٹیٹس حاصل ہو گیا۔ یوں ان کے ڈیرے کی ریاست میں دھوم مچ گئی۔

سردار بائی کے ڈیرے میں تین لڑکیاں تھیں: بینی، چمکی اور مینا۔ تینوں گنا گوں تھیں۔ ہر ایک اپنے ہی رنگ میں رنگی تھی۔ چھب اپنی اپنی۔ انداز اپنا اپنا۔ سبھاؤ اپنا اپنا۔

بینی جسم ہی جسم تھی، بلوری، روغنی، ریشمی جسم۔ سنہرا، روشن، تناسب کا نمونہ۔ سارے گھر پر جسم نے قبضہ جما رکھا تھا۔ بے چاری گھر والی۔ بینی باہر دہلیز پر پڑی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ جسم چھپائے سے چھپتا نہیں تھا۔ کپڑوں سے باہر نکل نکل آتا۔ حواس پر چھا جاتا۔ گرد و پیش کو سنہرا، ریشمی کر دیتا۔ حالانکہ ناچ اور گانے میں بڑی دسترس رکھتی تھی۔ گنی تھی۔ لیکن جسم گن کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا تھا۔

چمکی چمک کی لہر تھی۔ اتنی تیز تھی، اتنی ترت پھرت کہ یوں پھر جاتی جیسے خربوزے میں چھری۔ آنکھوں میں دھار تھی۔ ہونٹوں پر طنز۔ لیکن دبی دبی۔ ہاتھ نزہت سے بھرے

ہُوئے تھے۔ پاؤں میں گھنگھرو پہنتی تو وہ حرکت کے بغیر ہی چھن چھن کرتے۔ جسم میں حرکت مقیّد تھی، یوں جیسے بوتل میں جن۔ اب نِکلا کہ اب نکلا۔ جیسے کمان میں تیر پھنسا ہو۔ اب چھوٹا کہ اب چھوٹا۔

پھر مینا تھی۔ اس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ بالکل ماورائی، جیسے مندر میں جلتے نمانہ بجھی ہو۔ شخصیت میں دو عنصر نمایاں تھے۔ ایک طرف گریس کا دھارا جل رہا تھا، دوسری طرف تمکین کے پہاڑ تنے کھڑے تھے۔

جُنبش میں ربط تھا۔ روانی ایسی کہ کہیں دھوکا نہ لگتا تھا۔ بت اور چت میں کوئی ربط نہ تھا۔ بت بیٹھا رہتا، چت گُم۔ نہ جانے کہاں منڈلاتا۔ دیکھنے والا اُن جانے میں ڈھونڈ میں مُبتلا ہو جاتا۔

سردار بائی کے انگولا میں آتے ہی ریاست کے اُمرا اور اہل کاروں کے نوجوان بیٹوں نے ڈیرے کو اپنا لیا۔

نوجوان مل کر شامیں مخصوص کرا لیتے۔ راگ رنگ کی محفلیں ہوتیں۔ گفتگو ہوتی۔ ہنسی مذاق ہوتا۔ کھانا پینا ہوتا۔ نہ تو بدمستی ہوتی نہ ہی تخلیہ۔ سردار بائی نے آنے والوں پر واضح کر رکھا تھا کہ یہاں تفریح ہوگی، تماش بینی نہیں۔ اگر کوئی تخلیے کا خواہش مند ہو تو گھر بُلا لے۔

ریاست کے نواب رحم اللہ بیگ ویسے تو ماڈرن خیالات کے حامی تھے، وسیع القلب تھے، لیکن رکھ رکھاؤ کے شدّت سے قائل تھے۔ ذرا سا وقار میں فرق آجاتا تو ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا۔

انھوں نے اپنے بڑے بیٹے کمال اللہ بیگ پر بارہا واضح کر رکھا تھا کہ بیٹے جو چاہو کرو، ہم کوئی پابندی عائد نہیں کرتے۔ مگر وقار کو کسی صورت ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ بیٹے، چینی کے برتن میں ایک بار بال آجائے تو وہ ہمیشہ کے لیے معضروب ہو جاتا ہے۔

وقار بھرے ماحول میں تیس سال گزار کر کمال میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس میں

جذب کر لینے کی صلاحیت بیدار ہو چکی تھی۔

کمال کے دوست اسے بار بار مجبور کرتے رہے کہ چلو، بائی کے ڈیرے پر چلیں۔ پہلے تو وہ ٹالتا رہا، لیکن پھر مجبور ہو گیا۔ رُوپ بدل کر جانے کے لیے تیار ہو گیا اور انھیں تاکید کر دی کہ بھید نہ کھولیں۔

گیا تو تفریح کے لیے تھا، لیکن مینا کے ماورائی وقار نے پتا نہیں کیا کر دیا۔ دوستوں کے رُوبرو خود کو سنبھالا۔ بڑی مشکل سے محفل میں حاضر رہا، پر بظاہر۔ اندر سے حاضر نہ تھا۔ ادھر مینا بھی حاضر نہ تھی۔ بت تھا، چِت نہ تھا۔ اس کا تو خیر یہی معمول تھا۔ کمال مینا کے چِت کی ڈھونڈ میں کھو گیا تھا۔ اگلے روز رات کو خواب گاہ میں مینا کا بت پھر سامنے آ بیٹھا۔ بولا "چِت کو ڈھونڈ" ساری رات ڈھونڈ میں بیت گئی۔

جب تین چار راتیں یونہی گزریں تو وہ گھبرا گیا۔ ایسا تو کبھی نہ ہُوا تھا۔

دُوسری بار جب وہ دوستوں کے ہمراہ ڈیرے پر گیا تو ساتھی بینی اور چمکی کی طرف متوجہ رہے اور کمال کو مینا سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

زیرِ لب بولا "آپ کہاں ہیں؟"

مینا نے چونک کر دیکھا لیکن منھ سے نہ بولی۔

کمال نے کہا "ایک لمحے کے لیے یہاں آ جائیے نا۔"

"کہاں آ جاؤں؟" اس نے پُوچھا۔

"جہاں آپ بیٹھی ہیں، وہاں۔"

وہ مُسکائی۔ بولی "میں تو یہیں ہُوں۔"

"یہاں تو خالی بت ہے۔"

وہ پھر مُسکرائی "خالی بت ہی تو ہُوں۔"

"کتنا اچھا ہوتا" کمال نے کہا "اگر خالی بت ہی ہوتیں۔"

"کیوں؟" اس کی بھویں کمان بن گئیں۔

"خالی بت ہوتیں تو میں ڈھونڈ میں نہ پڑتا۔"

اس کے ہونٹوں پر ادھوری مسکان آ ٹکی۔ بولی "سامنے دھری کی ڈھونڈ کیسی؟"

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کمال نے زیرِ لب پوچھا "اگر گھر پر بُلاؤں تو آجائیں گی؟"

"میں آنے جانے والی کون ہوں" وہ بولی "بھیجنے والی سے پوچھیے۔" اُس نے سردار بائی کی طرف اشارہ کیا۔

چار ایک دن بعد محل سے دُور، بائیں باغ کے دیوان خانے کے سامنے ایک بگھی رُکی۔ سیاہ نقاب میں ملفوف خاتون نکلی۔ برآمدے میں نوابزادہ کمال منتظر کھڑا تھا۔

نوابزادے نے کہا "ہمارا نام کمال ہے۔"

"مجھے پتا ہے" وہ بولی "پہلے آپ رئیس زادے تھے، اب نواب زادے ہیں۔"

وہ اسے کمرے میں لے گیا۔ چائے آگئی، اور وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے چائے پیتے رہے۔

پھر وہ بولا "ہم نے آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ ہمارے لیے آپ سے دُور رہنا مشکل ہوگیا ہے۔"

"میری خوش قسمتی ہے" وہ بولی۔

"اونہوں" وہ بولا "رسمی باتیں نہ کیجیے۔ بھول جائیے کہ آپ کون ہیں، ہم کون ہیں۔"

وہ شرارت سے مسکرائی۔ بولی "بھول گئی۔"

وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ بولا "آپ کو علم نہیں ہم بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے ہیں۔"

"کیوں؟ خیریت؟" مینا نے پوچھا۔

وہ رُک گیا۔ بولا "خاتون، ہمیں آپ سے محبت ہوگئی ہے۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ نظریں جھکائے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔ محبت کا اظہار تو اس سے زندگی میں کئی ایک نے کیا تھا، مگر نواب زادے کے اظہار کی سُرتال مختلف تھی۔

"آپ سُن رہی ہیں؟" وہ بولا۔

"سُن رہی ہُوں۔"

"خُدارا جواب میں کچھ تو کہیے" وہ بولا۔

اُس نے سر اُٹھایا۔ کہنے لگی "نوّاب زادہ صاحب، جو خریدی جاسکتی ہے اس سے محبّت کیسی؟"

"ہمیں بت نہیں چاہیے" وہ بولا۔

"نوّاب زادہ صاحب، چت کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔"

"سچ کہتی ہیں آپ" وہ بولا "چت بس میں نہیں ہوتا۔ ہم خود بے بس ہو رہے ہیں۔"

"بت سے دل بہلائیے، نوّاب زادہ صاحب، بہلاتے رہیئے، حتیٰ کہ دِل بھر جائے۔ چت کی ڈھونڈ نہ رہے۔"

دیر تک وہ چُپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر قریب آکر مینا کا ہاتھ تھام کر بولا "ہم نے آپ کو دل بہلانے کے لیے نہیں بُلایا۔ ہم آپ کو دل بہلاوا نہیں سمجھتے۔"

اس کے ہاتھ میں عجیب سا "نگ" تھا۔ مدّھم گرمی اس کے جسم میں سرایت کرتی جارہی تھی۔

دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر بولی "ایک بات پُوچھوں؟"

"پوچھیے۔"

"بُرا تو نہیں مانیں گے، آپ؟"

"نہیں۔"

"آپ کو پتا ہے، محبت کسے کہتے ہیں ؟"

اس سوال نے اسے ڈنک مارا۔ دیر تک خود کو سنبھالتا رہا۔ پھر بولا " پتا نہیں۔ ایسی کیفیت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ کو تو پتا ہو گا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔"

"ہاں" وہ بولی "پتا ہے۔ محبت سے جس قدر بائی واقف ہوتی ہے، شاید کوئی اور نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ بائی ہوس کی بدروہ کو لت پت ہو کر پاٹ چکی ہوتی ہے۔ کامنا سے بے زار ہو چکی ہوتی ہے۔ جسم کے بندھن سے بے نیاز ہو چکی ہوتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے ہماری محبت جسم سے بندھی ہے ؟"

"پتا نہیں" وہ بولی "لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ آپ ہوس میں لت پت نہیں ہوئے۔ جسم سے بے نیاز نہیں ہوئے۔"

وہ سوچ میں کھو گیا۔ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

پھر وہ بولا "ایک بات پوچھوں ؟"

وہ مسکرائی "نہیں۔ میں برا نہیں مانوں گی۔ پوچھیے۔"

"آپ کو کسی سے محبت ہوئی ہے کیا ؟"

"ہاں" وہ بولی "ہوئی ہے۔ ہے۔ رہے گی۔"

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا "میں نے ناحق آپ کو زحمت دی" وہ بولا۔

"خدارا، ناراض نہ ہوں" وہ بولی "مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ آپ پہلے مرد ہیں جو مجھ سے دل کی بات کہہ رہے ہیں۔ آپ پہلے مرد ہیں جس سے میں دل کی بات کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کر رہی۔ آپ نے مجھے عورت کی حیثیت دی ہے ورنہ بائی کو فرد کی حیثیت کون دیتا ہے۔ جو بھی ملتا ہے، ہوس کی ڈگڈگی بجانا شروع کر دیتا ہے۔ ہوس کی ڈگڈگی کی لے پر ناچنا ہی ہمارا دھندا ہے۔"

وہ پھر سوچ میں کھو گیا۔ دراصل وہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ مینا ایک ساعت

کے لیے ہچکچائی، پھر بولی "پہلے ایک بات کا فیصلہ کر لیجیے۔ کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے یا درپردہ آپ کی خواہش ہے کہ میں آپ سے محبت کر دوں؟ میرا مطلب ہے کیا توجہ طلبی مقصود ہے؟"

اسے شدید دھچکا لگا۔

وہ اپنی ہی دھن میں کہے گئی "میری دانست میں محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی۔ محبت صرف کی جاتی ہے۔ چاہے دوسرا کرے نہ کرے۔ محبت ایک ہاتھ کی تالی ہے۔ اس میں نہ شکوے کی گنجائش ہے، نہ شکایت کی۔ نہ وفا کی شرط، نہ بے وفائی کا گلہ۔" وہ رک گئی پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولی "محبت لین دین نہیں، صرف دین ہی دین ہے۔" ان جانے میں اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی، جیسے دم رک رہا ہو۔

اگلے روز کمال رہ رہ کر مینا کی باتوں پر سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ عجیب زاویۂ نظر تھا۔ اس نے ایسے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مینا کی وہ بات اسے کھا گئی تھی کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں، یا میری توجہ کے طالب ہیں۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ توجہ کا طالب ہے۔ اس کی محبت صرف دین ہی دین نہیں، لین دین ہے۔

اس خیال سے اسے ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ دفعتاً اس کے اندر جذبات کا ایک ریلا ابھرا۔ زیرِ لب بولا "نہیں۔ میری محبت توجہ طلبی سے ملوث نہیں ہوگی۔ کبھی نہیں۔"

شام کو اس کا دوست جاہ آگیا۔ آتے ہی بولا "جی چاہتا ہے ایک بار پھر آسادری چلیں۔ کیا خیال ہے؟"

"بے کار ہے" نواب زادے نے کہا۔

"بے کار؟" جاہ چلایا "اتنی رنگین محفل ہوتی ہے کہ نشہ آجاتا ہے۔"

"کہیں دل تو نہیں لگ گیا تمھارا؟"

جاہ ہنسا "اوہنوں ۔ یہ باتیاں دل لگی کی چیز ہیں ، دل لگانے کی نہیں"۔ پھر دفعتہً اُسے یاد آ گیا۔ بولا "پتا ہے، جمال آیا ہُوا ہے۔"

جمال ان کا ایک ساتھی تھا۔ بڑا ہی رنگین مزاج تھا۔ محفل میں جان ڈال دیتا تھا۔ لیکن طبیعت اوباشی کی طرف مائل تھی۔ چونکہ تاجر تھا، اس لیے ذہنیت پر تاجرانہ رنگ غالب تھا۔ کمال کو جمال کا کردار پسند نہ تھا۔ اگرچہ اس نے اپنی ناپسندیدگی کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں جمال کے نام پر ہی دل میں نفرت کی دھار چل جاتی تھی۔

"مجھے ملا تھا" جاہ نے کہا "آپ سے بہُت متاثر ہے۔ بڑا احترام کرتا ہے آپ کا۔ دراصل آپ کو اپنا آئیڈیل مانتا ہے۔ بچارے سمجھ لیجیے۔ اب کی بار آسادری جائیں تو اسے ساتھ لے جائیں۔"

"ہوں" کہ کر کمال نے بات ٹال دی اور پھر بات کا رُخ بدل دیا۔

اُدھر آسادری میں اُسی روز جب مینا فراغت کے دوران بیٹھی کمال کی باتوں پر سوچ رہی تھی تو سردار بائی آ گئی۔ بولی "می نے، رات نواب زادے نے کوئی بات کی؟"

"کیسی بات؟" مینا نے پُوچھا۔

بائی بولی "وہ تماش بین نہیں دِکھتا۔ ضرور کچھ کہنے کے لیے تمھیں بُلایا ہوگا۔"

"بس وہی باتیں جو مرد کیا کرتے ہیں" مینا نے بائی کو ٹالنا چاہا۔

سردار بائی مُسکرائی۔ بولی "می نے، اس بات کو کیا چُھپانا جو ماتھے پر لکھی ہو۔ بند بند میں ناچ رہی ہو۔ تُو تو اس بات سے چھلک رہی ہے جو نواب زادے نے رات تجھ سے کی تھی۔"

مینا خاموش بیٹھی رہی۔

بائی بولی "مجھے پتا ہے تُو نے اپنے دِل کا دوار بند کر رکھا ہے، اس لیے کہ تجھے محبّت کا روگ لگا ہُوا ہے۔ ہم نے قاسم کو صرف اس لیے چھوڑا تھا می نے، کہ تیرا محبوب

وہاں رہتا تھا اور میں ڈرتی تھی کہ تو کوئی ایسا قدم نہ اُٹھا لے کہ واپسی ناممکن ہو جائے۔ اس لیے ہم قاسم پور چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے۔"

مینا نے حیرت سے بائی کی طرف دیکھا: اچھا، تو نقلِ مکانی کی وجہ یہی تھی۔

"دیکھ، می نے،" بائی نے کہا "تجھے دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آ جاتی ہے۔ میں بھی تیری ہی طرح تھی۔ بے پروا، بے نیاز، نڈر۔ مجھے بھی محبت ہو گئی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ میری محبت ایک ہاتھ کی تالی ہے، پھر بھی میں سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس آ گئی تھی۔ اور پتا ہے، می نے، اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اُس نے مجھے دھندے پر لگا دیا اور میری کمائی سے اپنی محبوبہ کو عیاشی کرانے لگا۔"

"سردار بائی،" مینا بولی "مجھے پتا ہے، میرا بھی یہی انجام ہو گا۔ لیکن میں بہت دُور نکل آئی ہوں۔ میں نے واپسی کی کشتیاں جلا دی ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ اوباش ہے، ہرجائی ہے۔ لیکن سردار بائی، عورت جب بھی کرتی ہے ذات سے محبت کرتی ہے، صفات سے نہیں۔"

"پتا نہیں، کیا ہونے والا ہے" سردار بائی نے لمبی آہ بھری "پر ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ کل ہی میں نے تیرے محبوب کو یہاں دیکھا ہے۔ پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ وہ تو اسی شہر کا رہنے والا ہے۔ کیا اتفاق ہے۔ آگ سے بچنے کے لیے بھاگے، چولھے میں آ گرے۔"

مینا نے تڑپ کر بائی کی طرف دیکھا۔

"فکر نہ کر،" وہ بولی "آج نہیں تو کل تجھ سے ملنے آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ ڈیرے پر — ضرور آئے گا۔ پر تیرے لیے نہیں۔ تفریح کے لیے۔ دل لگی کے لیے۔"

کمال نے بہت کوشش کی کہ وہ مینا کی محبت سے بے نیاز ہو جائے، لیکن وہ ایسا نہ کر سکا، اور جلد ہی مینا کو گھر بلانے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے بعد وہ دو چار بار ملے۔ جب بھی ملتے کتر کتر باتوں کے ڈھیر لگا دیتے۔ تھک جاتے تو تاش کھیلتے۔ مینا کمال سے شطرنج کھیلنا سیکھتی۔ بار بار چائے پیتے۔ سگریٹ پھونکتے۔ اور پھر سے باتوں میں لگ جاتے۔ یونہی رات گزر جاتی۔ اس دوران میں مینا بار بار کمال سے پوچھتی کہ آپ ڈیرے پر کیوں نہیں آتے۔ اور کمال ہنس کر جواب دیتا "می نے، میں نے تمہاری خاطر بہت کچھ چھوڑ دیا۔ احساسات، جذبات، خیالات۔ اب ایک چھوٹا وقار باقی رہ گیا ہے۔ وہ تو مجھ سے نہ چھینو۔"

پھر ایک روز دوپہر کے وقت جب وہ کام میں مصروف تھا، تو اس کے خاص ملازم الہٰی بخش نے اسے ایک بند لفافہ دیا۔ کہنے لگا "یہ خط ان کے ڈیرے سے آیا ہے۔" خط میں لکھا تھا:

میری خاطر ایک کام کیجیے۔ بڑی بائی سے کہہ کر مجھے اپنے ہاں بلوائیے۔ آج ہی۔ لیکن کبھی نہ بھیجیے۔ اور میرا انتظار بھی نہ کرنا۔ میں آؤں گی نہیں۔

نیچے نام کی جگہ خالی "م" لکھا ہوا تھا۔

یہ ایک عجیب خط تھا۔ مجھے بلوائیے، لیکن میں آؤں گی نہیں۔ دیر تک وہ سوچتا رہا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ پھر سینے پر چھری سی چل گئی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ نسیں ڈھولکی کی طرح بجنے لگیں۔ اچھا، تو میری محبت کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ میرے پردے میں کسی سے ملنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔

اس کی ذات کے وقار کو بری طرح ٹھیس لگی۔ سارا دن وہ خود کو سمجھاتا رہا: ٹھیک تو ہے۔ یہ تو ایک ہاتھ کی تالی ہے۔ نہ شکوہ نہ شکایت۔ نہ امید نہ توقع۔ لیکن اندر ایک آگ سلگتی رہی۔ ایک شعلہ دل کو چاٹتا رہا۔ "جو مزاجِ یار میں آئے" کا بھرم ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

سارا دن وہ خود کو سمجھاتا رہا: نہیں نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہوگا۔

لیکن ایسا ہوتا رہا۔ ایک بے چینی اسے کھائے جا رہی تھی۔

شام پڑی تو وہ اور بھی مضطرب ہو گیا۔ اضطراب سے اس قدر چھلکنے لگا کہ چھینٹے اُڑنے لگے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کوئی یہ کیفیت دیکھ نہ لے۔ اگر ابا حضور نے بُلا لیا تو؟ اگر امی جان آ گئیں تو؟

اُس نے خود کو ایک چُغے میں لپیٹا، سر پر کنٹوپ پہنا اور ربڑ سے رین کوٹ میں چُھپ چُھپا کر باہر نکل گیا۔ اسے پتا نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کبھی رُک جاتی، کبھی پڑنے لگتی۔ گلیوں میں کیچڑ ہو رہا تھا۔ وہ کیچڑ اور بارش سے بے نیاز چلا جا رہا تھا۔ اس کا احساسِ وقار بُری طرح مجروح ہُوا تھا۔ اندر سے وہ ایک زخمی پرندے کی طرح تڑپ رہا تھا۔

گلیاں ویران پڑی تھیں۔ لوگ سرِ شام ہی گھروں میں دروازے بند کر کے بیٹھ گئے تھے۔

دفعتہً وہ رُک گیا۔ گلی میں ایک چھجّے کے نیچے، سیاہ نقاب میں لپٹی، ایک خاتون دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے کھڑے ہونے کا انداز مانوس سا ہو۔

"کیا میں آپ کی کوئی خدمت . . . . ؟"

"ارے!" وہ چلّائی "آپ ہیں! آپ اِدھر کہاں؟"

اُس نے مینا کو پہچان لیا "آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟"

"بارش ہو رہی ہے" وہ بولی۔

"بارش بند کرا دیں کیا؟"

وہ ہنسی "مجھے سامنے والی گلی میں جانا ہے۔"

"تو چلیے۔ میں چھوڑ آؤں۔"

"میں پھسل جاؤں گی" وہ بولی "میرا جوتا خراب ہو جائے گا۔"

"تو چلیے، میں اُٹھا کر چھوڑ آؤں۔"

اُس نے بڑھ کر اُسے بازوؤں میں اُٹھا لیا۔

وہ گھبرا گئی۔ کہنے لگی "لوگ دیکھ کر کیا سمجھیں گے؟"

"سمجھیں گے کہ خاتون بیمار ہے۔ معالج کے پاس لے جا رہے ہیں؟"

کُچھ دیر کے بعد وہ بولی "رُک جائیے۔"

وہ رُک گیا۔

مینا اس کے بازوؤں سے پھسل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر جُھک کر آداب بجا لائی "بہت بہت شکریہ۔ خُدا حافظ!" یہ کہہ کر وہ دروازے سے مکان میں داخل ہو گئی۔

اتفاقاً کمال کی نگاہ مکان میں لگی ہوئی نیم پلیٹ پر پڑی: صاحبزادہ جمال۔ اس کے سینے میں گویا کسی نے خنجر گھونپ دیا۔ بُری طرح سے لڑکھڑایا۔ پھر شرمندگی اور خجالت کے پسینے سے شرابور ہو گیا۔ یہ ذلّت کی اِنتہا تھی۔

کوئی اور ہوتا تو شاید اسے اس قدر اذیّت نہ ہوتی، لیکن جمال ایک خود غرض، اوباش مطلب پرست، چھوٹا آدمی۔ اس کا رہا سہا وقار خجالت کے پسینے میں بہ گیا اور اُس نے محسوس کیا جیسے کسی نے اسے اندھیرے کنوئیں میں دھکّا دے دیا ہو۔ گرد و پیش معدوم ہو گئے۔ ایک مٹیالے دشت نے اسے چاروں سے طرف گھیر لیا۔ پھر اسے کچھ پتا نہ رہا۔ نہ سمت رہی، نہ رُخ رہا۔ نہ مینا رہی۔

مینا کمرے میں داخل ہوئی تو جمال حیرت سے چلّایا "تم آ گئیں! اس بارش میں! میں تو سمجھا تھا تم نہیں آ سکو گی۔"

"دیکھ لو" وہ مُسکرا کر بولی "آ ہی گئی۔"

کمال کر دیا تم نے !"

"آنے والے، آہی جاتے ہیں" وہ بولی۔

دفعتہً جمال کی نگاہ اس کے جوتے پر پڑی" ارے !" وہ بولا" تمھارے جوتے تو سوکھے ہیں۔ یہ کیسے ہوا ؟

" مجھے وہ چھوڑ گئے ہیں نا" اُس نے جواب دیا

" وہ چھوڑ گئے ہیں ؟ گاڑی میں چھوڑ گئے ہیں کیا ؟"

" نہیں" مینا نے جواب دیا " گاڑی میں نہیں، بانہوں میں اُٹھا کر چھوڑ گئے ہیں "

"بانہوں میں اُٹھا کر ؟ لیکن کون چھوڑ گئے ہیں ؟

" نواب زادہ کمال" وہ بولی۔

نواب زادہ کمال !" جمال کا مُنھ کھلا کا کھُلا رہ گیا۔

" نواب زادہ کمال !" اسے دھچکا سا لگا " تمھیں چھوڑ گئے ہیں ! میرے گھر! بانہوں میں اُٹھا کر ! نواب زادہ خود !" گرد و پیش اس کی نظروں میں دُھندلانے لگے۔ دُھندلا تے گئے۔ " نواب زادہ کمال !" وہ دیوانہ وار دُہراتا رہا "میرے گھر !" پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ مینا کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہ میں مینا دُھندلاتے جا رہی تھی۔

دفعتہً ایک دھچکا سا لگا، اور مینا معدوم ہو گئی۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا " نواب زادہ کمال !" مُنھ سے جھاگ نکلنے لگے اور وہ دیوانہ وار کمرے سے باہر نکل گیا۔

انگولا سے رُخصت ہوتے وقت جب میں دوبارہ مزاروں پر گیا تو میری توجہ کا مرکز وہ دو رنگا درخت نہ تھا۔ میری نگاہ دونوں مزاروں پر مرکوز تھی۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی درخت کی ٹہنی سے ایک سُرخ ٹلی باندھ دُوں۔

بوڑھی عورت بدستور چاردیواری سے ٹیک لگائے، گٹھڑی بنی، اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ دیر تک میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

پھر دفعتہً میرے ذہن میں ایک کرن سی پھوٹی۔ میں نے مدھم آواز میں کہا :

"می نے "

وہ یوں تڑپ کر مڑی جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "مینا، کیا تم ابھی تک ایک ہاتھ کی تالی بجائے جا رہی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں ایک طوفان اُبھر آیا، جیسے سمندر کوزوں میں سما گیا ہو۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

مانا نمانہ

نمانہ کی والدہ خانم پر گھبراہٹ طاری تھی کہ کس طرح بیٹی سے رشتے کی بات کرے۔ ڈرتی تھی کہیں انکار نہ کر دے۔ وہ اپنی بیٹی کے ادلتے بدلتے موڈ سے خائف تھی۔ اس انتظار میں تھی کہ اچھے موڈ میں ہو تو بات کرے۔ بار بار چھوٹی انجنا کو بھیجتی "جا، انجنا، جا کر دیکھ تو۔ تیری باجی کیا کر رہی ہے؟"

خانم کی خالہ زاد عنبرین نے جو عرصہ دراز سے نیروبی میں مقیم تھی اور جہاں ان کا کاروبار تھا، اپنے بیٹے سلمان کے لیے نمانہ کا رشتہ مانگا تھا۔ خط میں سلمان کی تصویر بھی بھیجی تھی۔ یہ بھی لکھا تھا کہ دو مہینے پہلے سلمان پاکستان آیا تھا۔ تلاش کے باوجود آپ کا گھر نہ ملا، ورنہ مل کر آتا۔

خانم بار بار سلمان کی تصویر دیکھتی، دُعائیں مانگتی: اللہ کرے نمانہ کو پسند آ جائے۔ پھر انجنا سے کہتی "انجنا، تیری باجی کا موڈ کیسا ہے؟ جا کر دیکھ تو۔"

نمانہ کرسی پر بیٹھی میز پر پڑے ہوئے چائے کے پیالے کو گھور رہی تھی۔ دایاں پاؤں چل رہا تھا، جیسے انڈا پھینٹتے ہوئے چمچہ چلتا ہے۔ بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ پیشانی پر تیر گھدا ہوا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں پر دیکھ نہیں رہی تھیں۔ پتا نہیں وہ کہاں تھی۔ شاید کہیں بھی نہیں تھی۔

انجنا نے ایک نظر دیکھا اور لوٹ گئی۔ ظاہر تھا کہ نمانہ پر موڈ طاری ہے۔ بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

نمانہ کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خود سے کیا کہے۔

اس کی خواہش تھی کہ کچھ کرے۔ سیدھی سادی بات نہیں، کوئی انوکھی بات، جو پٹاخے کی طرح بھک سے اُڑ جائے، اُڑا دے، چونکا دے۔ کسی کو بھی، چاہے دوسروں کو، چاہے خود کو۔

یہ نہیں کہ نمانہ نے خود سے کچھ کیا نہ تھا۔ بہت کچھ کیا تھا۔ انوکھا۔ ان ہونا۔ حیران کن۔ کئی ایک پٹاخے چلائے تھے۔ پٹاخے سے اسے شکایت تھی کہ ایک بار چل کر ٹھس ہو جاتا ہے۔ چلے نہیں جاتا جیسے پہیا چلے جاتا ہے۔

نمانہ کی والدہ خانم پرانے زمانے کی خاتون تھی۔ سمجھ دار تھی۔ سیانی تھی۔ لیکن جب سے بچے جوان ہوئے تھے، بے چاری کنفیوزڈ ہو کر رہ گئی تھی۔ جب بھی کوئی بات کرتی تو لڑکیاں بڑے پیار سے اسے بغل میں دبا لیتیں۔ کہتیں "امی، آپ اس بات میں دخل نہ دیں۔ آپ نہیں سمجھتیں"۔ اس کے باوجود امی بات جاری رکھتیں تو نمانہ کانوں پر ہتھیلیاں رکھ لیتی "امی، بور نہ کرو نا۔ پلیز امی!" خانم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نوجوان بات بات پر بور کیوں ہو جاتے ہیں۔

انجنا کے سمجھانے کے باوجود بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کہتی "بیٹی، یہ بور ہونا کیا ہے؟ ہمارے زمانے میں تو کوئی بور نہیں ہوتا تھا۔ نہ موڈ ہوتے تھے۔ آج کل تو ہر نوجوان کو، چاہے لڑکا ہو یا لڑکی، بور ہونے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ ہر وقت۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

انجنا سمجھانے لگتی تو نمانہ اسے اشارہ کر کے منع کر دیتی "ہٹاؤ، انجنا۔ امی نہیں سمجھیں گی۔ جو لوگ جینے کی تڑپ سے محروم ہوں، بھڑک کر جلنے سے خائف ہوں، وہ بور کیسے ہوں گے بھلا۔ جو بور ہونے کی صلاحیت سے محروم ہوں، وہ بوریت کو کیسے سمجھیں گے!"

نمانہ میں بور ہونے کی کیفیت اس زمانے سے شروع ہوئی تھی جب اس کے ذہن میں یہ خواہش ابھری تھی کہ کچھ کر دوں۔ کر دکھاؤں کوئی نئی بات۔ ان سنی۔ جو چونکا دے۔ اور کچھ نہیں تو موم بتی کو دونوں سروں پر جلا کر بیٹھ جاؤں۔

نمانہ ایک کھاتے پیتے گھر کی عام سی لڑکی تھی۔ شکل و صورت اچھی تھی۔ ایسی نہیں جسے خوبصورت کہا جا سکے۔ خد و خال خاصے چست تھے۔ بدن چھریرا۔ آنکھ میں چمک۔ ابھی اس

چمک نے خصوصی رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ کبھی ذہانت، کبھی شرارت۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ سکول میں پڑھتی تھی۔ ابھی خود پر نیلیتے کناریاں نہیں لگاتی تھی۔ اس زمانے میں صرف ایک جذبہ طاری تھا کہ ہر وقت رومانی گیتوں کی گود میں بیٹھ کر جھولتی رہے۔ یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ ہمارے ہاں ہر لڑکی، جوانی کی اولین بیداری سے بھرپور انگڑائی تک، فلمی گیتوں کے جھولنے میں جھول جھول کر بڑی ہوتی ہے۔ شاید کھٹائی چاٹنے کی طرح عنفوانِ شباب کا یہ بھی ایک تقاضا ہو۔

مشکل یہ ہے کہ والدین نے کبھی عنفوانِ شباب کے حادثے کی طرف توجہ نہیں دی۔ اسے حادثہ نہیں سمجھا۔ اس آتش فشاں کے جاگنے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اس کایا پلٹ کو کایا پلٹ نہیں سمجھا، جس کے تحت ایک رینگتی ہوئی سُنڈی تتلی بن جاتی ہے۔

نمانہ ان دنوں رینگتی ہوئی سُنڈی تھی۔ تتلی بننے تک کئی مرحلوں سے گزری۔ سب سے پہلے رُومانی گیتوں کی مدھم آنچ پر پکتی رہی۔ پکتی رہی۔ اور پکنے سے پہلے ہی پک گئی۔ ان دِنوں اس کے پاس دو ٹرانسسٹر تھے۔ ایک سرہانے دھرا رہتا، دوسرا جیبی۔ لیٹتی تو سرہانے دھرا لوریاں دیتا۔ یہ لوریاں بھی کیا لوریاں ہوتی ہیں۔ نہ سونے دیتی ہیں، نہ جاگنے دیتی ہیں۔ سوئے سوئے جاگنا۔ جاگے جاگے سوئے رہنا۔ باتھ میں جاتی تو سامنے دھرا ہوتا۔ سکول میں جاتی تو جیب سے گیتوں کے بول چھپتھپاتے۔

کتاب پڑھتے ہوئے بھی "وحشتوں کا ساتھی ہو" کی آرزو اِردگرد منڈلاتی۔ اس پر ایک نئی مشکل پیدا ہو جاتی۔ وحشتیں ہوں تو ان کے ساتھی کی آرزو کرو۔ پہلے وحشتیں پیدا کرو، اور وحشتیں پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

جب ہر وقت آپ بلما کو آ آ کرتے رہیں۔ اس کے انتظار میں بتی بال کے بنیرے اڑتے رکھیں۔ اس کی خیالی چھتری کو گھٹ گھٹ جپھیاں پاتے رہیں۔ تصوّر میں مل جائے تو آپ کو زندگی مل جائے۔ اور پھر آپ اس پر "ہو ہو گئی قربان" ہوتے رہیں۔ اسے اُٹھنے نہ دیں۔ یونہی پہلو میں بیٹھے رہو۔ اور ظالم سماج کو کوستے رہیں جو دو ہرے میں دیری بن کر وسدے ہیں اور پایل کی جھنکار کو بیرن بنا دیتے

ہیں۔ ان حالات میں بے چارہ پھل پکنے سے پہلے رسنے نہ لگے تو کیا کرے۔

پھر وہ کالج میں چلی گئی، اور خود پر گوٹے کناریاں سجانے لگی۔

اس رومانی دور میں چار ایک لڑکے نمانہ کے قریب آئے۔ دو تو کزن تھے، جو دُور کھڑے ہو کر کبوتر سی آنکھیں بنا کر دیکھتے رہتے۔ قریب آتے تو جی جی کرنے لگتے۔ بھلا جی جی کرنے والے بھی کسی گنتی شمار میں آتے ہیں کیا۔ دو ایک چمکیلے تھے، مرچیلے تھے۔ لیکن جرأت سے خالی تھے۔ یہ کھیل تو جرأت کا ہے۔ نمک مرچ بھلا کیا کر سکتے ہیں۔ البتہ پڑوسی جاندار تھا۔ اس میں گٹس تھے۔ آنکھ سے شرارے اُڑتے تھے۔ آنکھیں دیکھتی کم کم تھیں، بھیڑتی زیادہ تھیں۔ چیونٹیوں کی طرح چمٹ جاتیں۔ پنجے گاڑ دیتیں۔

مشکل یہ تھی کہ پڑوسی سامنے آتا، متبسّم نگاہوں کی پھلجھڑی چلاتا اور چلا جاتا۔ رُکتا نہ تھا۔ لڑکی کا المیہ یہ ہے کہ جو رُک جائے، وہ توجہ کے لائق نہیں رہتا۔ جو شرارہ چھوڑ کر چلا جائے، وہ ذہن میں اٹک جاتا ہے۔ سنجیدہ اور مخلص جھڑ جاتا ہے۔ تفریحی کانٹے کی طرح چُبھ جاتا ہے۔ اگر پڑوسی کچھ دیر اور قائم رہ جاتا تو شاید وہ نمانہ سے مانا بن جاتی۔ لیکن ایسا نہ ہُوا۔ پڑوسی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ نمانہ کو مرکز نہ ملا۔

مرکز نہ ملے تو خود مرکز بننے کی آرزو ابھرتی ہے۔

کالج جاتے ہُوئے وہ اس اُمید پر حرکت کی چنگاریاں چھوڑتی رہی کہ راہ گیر دیکھیں، چونکیں۔ لوگ دیکھتے، چونکتے۔ نمانہ کے دل میں خوشی کی رو دوڑ جاتی۔ اِطمینان سا ہو جاتا کہ سب اچھا ہے۔ چونکانا اس کا مشغلہ بن گیا۔

کالج میں نمانہ نے چار ایک شوخ لڑکیوں کا ایک ٹولا بنا لیا جس کا مسلک چونکانا تھا۔ اُستانیوں کو، سہیلیوں کو، کلاس فیلوز کو۔ یہ ٹولا سارے کالج میں مشہور تھا۔ ان کی جُرأت پر لڑکیاں تالیاں بجاتیں۔ چپ چپیتیوں کے دلوں میں لڈو پھوٹتے۔ اُستانیاں ان کی باتوں کو اَن سُنا کرنے کی آڑ میں غور سے سُنتیں، سراہتیں، پُرانی یادوں میں کھو جاتیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لیکن ایسا ہوتا ہے۔

جس کا مقصد چونکانا بن جائے وہ خود اثر سے بھیگنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ جو محروم ہو جائے وہ سوکھ کر کاٹھ بن جاتی ہے۔ دِقّت یہ ہے کہ عورت کی غایت بھیگنا ہے بھگو دینا ہے، سوکھنا نہیں۔ مرد کی طرح تن کر کھڑے رہنا نہیں۔ بیل کی طرح خود کو حوالے کر دینا ہے۔

نمانہ آہستہ آہستہ کاٹھ بنتی گئی۔ جوں جوں بنتی گئی توں توں رُومان کا شغل بے معنی ہوتا گیا حتّٰی کہ بالکل دل سے اُتر گیا۔ خوابوں کا دُولھا پس پُشت پڑ گیا۔ بنگلا اور کار آگے آ کھڑے ہوئے۔

یونیورسٹی میں چونکانے کے کوائف بدل گئے۔ وہاں نہ تو رنگین حرکات کام آتی تھیں نہ کیوٹ ہیر ڈُو۔ نہ گریس فُل پوز، نہ نخرا نہ بات۔ لوگ ان باتوں کو اپریشیٹ ضرور کرتے تھے چونکتے نہ تھے۔ چونکتے بھی تو چونک کو ایسا رب کر لیتے۔ پی جاتے کہ اظہار نہ ہو پائے۔

نمانہ کی نظر میں یونیورسٹی کے بیشتر لڑکے کراؤڈ کی حیثیت رکھتے تھے۔ صرف چند ایک دِل اِن کوشیچن تھے۔ وہ ایک تو خالص ڈرائنگ روم رز تھے۔ جیسے بینڈ باکس سے سیدھے یونیورسٹی آ گئے ہوں۔ ان کے پاس یا تو باس تھے اور یا میزز۔ دونوں مخملی تھے۔ شخصیت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ ہے بھی یا نہیں۔

چار ایک پھڑکیلے تھے۔ شو مارنے کے دلدادہ۔ شو روم بنا سجا۔ اندر دکان خالی۔ چار ایک کتابی تھے۔ رٹے رٹائے جملے بولتے۔ حوالے دیتے۔ امتحانوں میں پوزیشن کے دلدادہ۔ ایک انٹلکچول تھا۔ سارا دن لائبریری میں گھُسا رہتا۔ بات کرتا تو کتاب کی بُو آتی۔ لڑکیوں کی طرف کبھی توجہ نہ دی تھی۔ دیتا بھی تو تحقیقی قسم کی۔ انھیں شخصیت کے لحاظ سے کلاسی فائی کرتا رہتا۔ اس نے کلاس کی ہر لڑکی کو لیبل کر رکھا تھا۔ رعنا کلوپیٹرا تھی۔ جمیلہ پینگوئین۔ روزی گگلنگ ڈال۔ عاصمہ ایمزن۔ پیمرا فلمی ہیروئن اور نمانہ کوبرا۔

نمانہ کو پتا چلا کہ اسے کوبرا کا نام دیا گیا ہے تو اس کا ہُڈ اور بھی تن گیا۔ گردن بھی کاٹھ بن گئی۔ اس پر رضا نے اسے طعنہ دیا۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا "ہم نے کئی ایک کوبروں کو رام کر کے بین پر لپیٹ لیا ۔"

"پلاسٹک کے ہوں گے۔" نمانہ بولی۔

"زہر کی پوٹلی نکالنا جانتے ہیں ہم۔"

"پھر آنکھ کھل جاتی ہے" وہ ہنسی۔

رضا کو غصہ آ گیا، اس لیے کہ بہت سے لڑکے سن رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ لاجواب ہو جاؤ تو غصہ تو آتا ہی ہے۔

"ہم سے بچ کر رہو، محترمہ" اس نے گویا نعرہ لگایا۔

"رضا صاحب" وہ بولی "آپ تو صرف نعرے لگانا جانتے ہیں، یا بسوں کو آگ لگانا۔ میں بس نہیں ہوں۔"

تمام لڑکے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

رضا سٹوڈنٹ لیڈر تھا۔ اس کے ساتھ آٹھ دس حواری تھے۔ سب کے سب شو شے۔ پروفیسروں کے سامنے التزاماً مونچھ مروڑ کر بات کرتے۔ رضا گروپ سے سبھی ڈرتے تھے۔ لیکن نمانہ نے کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا۔

یونیورسٹی کے دور میں صرف ایک واقعہ ہوا تھا، جس نے نمانہ کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اسے بھول نہ سکی تھی۔ جب بھی یاد آ جاتا تو اس کی انا کو از سر نو ٹھیس لگتی۔ اس یاد میں لذت کا عنصر بھی تھا، جسے وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ بظاہر وہ ایک معمولی سا واقعہ تھا، لیکن جو زندگی بھر دوسروں کو چونکاتی رہی ہو، اسے کوئی چونکا دے، اس کی انا کو تہس نہس کر کے رکھ دے، تو بھولنا مشکل ہو جاتا ہے۔

دو ایک ماہ ہوئے ہوں گے، اس روز وہ لائبریری میں بیٹھی نوٹس لیتی رہی۔ شام پڑ گئی تو اٹھی۔ بس کی روانگی میں چالیس منٹ باقی تھے۔ سوچا، چلو کینٹین سے ایک پیالی پیتی چلوں۔

کینٹین خالی پڑی تھی۔ کوئی موجود نہ تھا۔ ایک میز پر چائے کا سیٹ دھرا تھا۔ پلیٹ میں چار ایک بسکٹ تھے۔ اس نے ٹی پاٹ کو ہاتھ لگایا۔ بھری ہوئی اور گرم تھی۔

عین اس وقت ایک تیکھا سا، تیز سا، نوجوان داخل ہُوا ۔ بے تکلفی سے بولا "بہت اچھا ہُوا آپ آگئیں۔ میرے لیے اکیلے چائے پینا مشکل ہو رہا تھا۔ اکیلے چائے پینے کی عادت نہیں ۔ بیٹھیے، چائے بنائیے۔ ایک پیالی میرے لیے بھی بنا دیجیے۔"

نمانہ کو اس بے تکلفی پر بڑا غصّہ آیا ۔ بات اَن سُنی کر کے مُڑی اور کینٹین کے لڑکے کو آوازیں دینے لگی "چھوٹے۔"

"لڑکا بیٹٹیر لینے گیا ہے ۔ ابھی آ جائے گا" نوجوان بولا "جب تک آپ چائے بنائیے۔"

نمانہ نے غصّے بھری نگاہ نوجوان پر ڈالی اور جانے کے لیے مُڑی ۔

نوجوان نے لپک کر اس کا راستہ روک لیا ۔ بولا "دیکھیے، اگر آپ یوں نہیں مانیں گی تو میں بانہوں میں اُٹھا کر کُرسی پر بٹھا دوں گا ۔"

نمانہ کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے "گٹ اسائیڈ" وہ چلّائی ۔ نوجوان نے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دے کر کرسی پر بٹھا دیا ۔ نمانہ چیخی چلّائی تو وہ بولا "یہاں آپ کی مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا ۔ چُپ چاپ چائے بنائیے۔" یہ کہہ کر وہ اس کے مقابل کی کرسی پر جا بیٹھا ۔ نمانہ چپ چاپ غصّے میں اُبلتی ہُوئی چائے بنانے لگی ۔

"آپ ڈرتی کیوں ہیں ؟" وہ بولا "آپ لڈّو تو نہیں کہ کوئی کھا جائے گا ۔ اور مجھے لڈّو کھانے کا شوق نہیں ۔ میں نے تو صرف یہ ریکوسٹ کی تھی کہ میرے ساتھ بیٹھ کر ایک پیالہ چائے پی لیں ۔ اس سے میرا کوئی مقصد نہ تھا ۔ معمولی سی کرٹسی ۔ تھینک یو" اس نے چائے کا پیالہ پکڑ کر کہا ۔

کچھ دیر تک دونوں چُپ چاپ چائے پیتے رہے ۔

"آپ کا غصّہ ابھی تک نہیں اُترا" وہ بولا "میری زیادتی پر آپ خود کو سزا کیوں دے رہی ہیں ؟ شاید آپ سوچ رہی ہیں کہ اتھارٹیز سے میری شکایت کریں گی ۔ بے کار ہے ۔ میں یونیورسٹی کا نہیں ہوں ۔ باہر سے آیا ہُوں ۔ یہاں ایک دوست سے ملنے آیا تھا ۔ وہ ملا نہیں تو یہاں چائے پینے آگیا ۔" وہ رُک گیا ۔

"پتا نہیں کیوں" وہ بولا "یہاں ہر لڑکی خود کو ہر وقت لڑکی سمجھتی ہے۔ کبھی بھول بھی جایا کریں کہ آپ لڑکی ہیں۔ اس قدر سیکس کانشس ہونا اچھا نہیں" وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "اب آپ جا سکتی ہیں۔ تھینک یو سو مچ۔ خدا حافظ"

نمانہ گھر پہنچی تو یوں تنی ہوئی تھی جیسے سارنگی کے تار۔ تناؤ ذرا کم ہوتا تو لذت کی ایک رو جسم میں دوڑ جاتی۔ اس پر احتجاج پیدا ہوتا اور وہ پھر سے تن جاتی۔ تنے جاتی تھی کنپٹیاں پھر سے بجنے لگتیں۔ اس وقت اس کے دل میں ایک خواہش تھی: انتقام، انتقام۔ پھر آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا۔ شدت کم ہوتی گئی۔ لیکن جب بھی چائے کا پیالہ سامنے آتا تو یاد تازہ ہو جاتی۔

نمانہ کی والدہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئی۔ ایک نظر نمانہ کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھی چائے کے پیالے کو گھور رہی تھی۔ نگاہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ پاؤں ہل رہا تھا۔

"بیٹی" وہ بولی "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے"۔ نمانہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ماں نے کہا "بیٹی، تیرے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ تو منظور کر یا نہ کر، تیری مرضی۔ ہم دخل نہیں دیں گے۔ یہ لڑکے کی تصویر ہے"۔ اس نے تصویر نمانہ کے سامنے رکھ دی۔

تصویر کو دیکھ کر نمانہ چونکی۔ آنکھیں غصے سے اُبل آئیں۔ اَن جانے میں پیر چلا یا یا شاید انگڑائی لی ہو۔ چائے کی پیالی گر کر چور چور ہو گئی۔

نوٹ:

قارئینِ کرام، نمانہ کے کردار اور واقعات کی روشنی میں آپ فیصلہ کریں کہ نمانہ نے کیا فیصلہ کیا؟ ہاں یا نہ؟ کیا جذبۂ انتقام جیت گیا، یا وہ دبی دبی خوشی جسے اُس نے کبھی اُبھرنے نہ دیا تھا؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بظاہر انتقام در پردہ خوشی۔ مصنف۔

دیوی

اونہوں! رانگ نمبر بہت آزما دیکھے۔ بے کار۔ سب ایک ہی بولی بولتے ہیں۔ آئی لو دیو ڈارلنگ ——— ہُنہہ، نہ دیکھا، نہ جانا، اور آئی لو دیو ڈارلنگ۔ بھلا کوئی بات ہوئی ——— سب کو محبت کا بخار چڑھا ہُوا ہے۔ میں تو اُکتا گئی۔ بور۔

آج صبح ایک رانگ نمبر کہہ رہا تھا "فالِنگ اِن لَو وِد یُو۔ وہاٹ ام آئی ٹو ڈو؟ آئی کانٹ ہلپ اِٹ۔" بے چارا بلپ لس۔ سبھی بلپ لس ہو جاتے ہیں، لڑکی کی آواز سن کر۔ اور پھر ملنے کا تقاضا ——— ہلو، ہلو، ہلو، پلیز۔ ڈارلنگ یُو مسٹ۔

پرسوں ایک اولڈش بول رہا تھا۔ میں نے سوچا ہٹ کر بات کہے گا ——— اونہوں! وہی ایک رٹ، جیسے ریکارڈ پر سوئی اٹک گئی ہو۔

سوچتی ہُوں یہ لَو کیا چیز ہے۔ ہر جگہ اسی کا ذکر ہے۔ قصّوں میں، کہانیوں میں، شعروں میں، گیتوں میں۔ اور یہ رانگ نمبر کا لَو جو ہے وہ تو خالی گُڈ ٹائم ہے۔ ہلّا گلّا۔ ممی تو مجھے گڑیا سمجھتی ہے۔ کہتی ہے: ڈالی، تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ کیوں نہیں سمجھتی بھلا؟ سب سمجھتی ہُوں۔ چودھویں سال میں ہُوں۔ اور پھر جس ماحول میں رہتی ہُوں اس کا تو کام ہی یہی ہے ——— سمجھانا۔ معلومات بہم پہنچانا۔ اشاروں کنایوں سے نہیں، کھُل کر بات کرنا۔ بھرے مُنھ سے کہہ دینا۔ لاگ لپیٹ نہیں۔ ہیرا پھیری نہیں۔ رکھ رکھاؤ نہیں۔ سپاٹ بات کہہ دینا۔ یُوں جیسے غصّے میں گالی بک دو ——— اشتہار میں، اخبار میں، فلمی گیت میں، چیپ ناول میں، ڈائجسٹ میں، ایک طوفان آیا ہُوا ہے ماس میڈیا کا۔ سمجھانے کا۔ انفرمیشن بہم پہنچانے کا۔

ابھی پرسوں کی بات ہے، خالو کہہ رہے تھے کہ آج کا چھ سال کا بچّہ جتنا کچھ جانتا ہے، پُرانے زمانے میں اتنا کچھ پچیّس سال کا جوان بھی نہیں جانتا تھا۔

پھر بھی ممی مجھے ڈال سمجھتی ہے۔ ڈالی کہہ کر بُلاتی ہے، مجھے کبھی اشنا کہہ کر نہیں بلایا۔ وہ سمجھتی ہے، میں کچھ نہیں سمجھتی۔ سمجھتی تو میں سب کچھ ہوں۔ بس یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوو کیا چیز ہے۔

ویسے لوو سے تو ہمارا اپنا گھر بھرا ہُوا ہے۔ یُوں بچ بچ کرتا ہے جیسے گلا ہوا آم ہو۔ ممی اور ڈیڈی اگرچہ اکھٹّے رہتے ہیں، مگر اکھٹّے نہیں رہتے۔ بڑے امینسی بیٹنڈ ہیں وہ۔ آپس میں انڈر سٹینڈنگ پیدا کر رکھی ہے: ڈارلنگ، تم اپنے رستے پر چلو، میں اپنے رستے پر۔ دونوں اپنے اپنے راستے پر چل رہے ہیں۔ کبھی کبھار ملاپ ہو جاتا ہے۔ شاید ہو جاتا ہو۔ ہم تو صرف ہیلو ہیلو سنتے ہیں۔

ممی کی مشکل یہ ہے کہ اسے علم نہیں کہ وہ پینتالیس سال کی ہو چکی ہے۔ پتا نہیں خود کو بیس کی سمجھتی ہے یا بائیس کی۔ ویسے تو اکثر آئینہ دیکھتی رہتی ہے، پر آئینے میں کبھی خود کو نہیں دیکھا۔ آئینے میں کوئی بھی خود کو نہیں دیکھتا، ورنہ بہُت سی مشکلات حل ہو جائیں۔ آئینے میں ہر کوئی وہ دیکھتا ہے جو دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں جو سامنے ہوتا ہے۔

بس ممی خود کو بنانے سنوارنے میں لگی رہتی ہے۔ میک اَپ ہو رہا ہے۔ بال کٹوائے جا رہے ہیں۔ گھنگھر بنائے جا رہے ہیں۔ سلمنگ کا بُخار چڑھا ہُوا ہے۔ شام کو یوگا، صبح کو ورزشی سائیکل، اور پھر دن بھر ڈائٹنگ۔ پیٹ بھر کر نہ کھاؤ۔ گھنٹے گھنٹے بعد کوئی سنیک، کوئی فروٹ، کوئی سلائس۔ میٹھا؟ اُونہوں! گھی! بالکل نہیں۔ اناج؟ کم کم۔ بیچاری ممی ــــ بھُوکی مر رہی ہے۔ پھر بھی پنڈا اتھل تھل کرتا ہے ـــــ ہیٹ! وِد اِن کو شیچن رہنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

پھر بھی ممی کامیاب ہے ــ ایک نا ایک فرینڈ ساتھ لیے پھرتی ہے۔ پہلے ڈیوڈ تھا،

پھر افضل تھا، اب توقیر ہے۔ ڈیڈی تو اس معاملے میں پاسٹ ماسٹر ہیں۔ ہر وقت اِرد گرد کالج والیوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔

ڈیڈی بنتے سنورتے نہیں۔ اپنی ایج کیمافلاج نہیں کرتے۔ بناوٹ، سجاوٹ، اڈریس ڈیپورٹمنٹ سے بے نیاز ہیں۔ ڈیڈی کو ان باتوں کی کیا پروا۔ انھیں باتیں جو کرنی آتی ہیں۔ مائی گاڈ! کیا باتیں کرتے ہیں۔ سُننے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیسی کیسی بات ذہن سے نکالتے ہیں کہ مداری کا چھو منتر شرما کر رہ جائے۔

ڈیڈی بہت پڑھے لکھے ہیں، لیکن کیا مجال کہ بات میں سے کتاب کی بُو آئے یا فلسفے کا پتھر نکلے۔ بالکل نہیں۔ ہلکی پھلکی شگفتہ باتیں۔ سادہ۔ بنی سجی نہیں۔ لفظ نہیں۔ باتیں۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ اور پھر بات ایسی جیسے پھلجھڑی چل گئی ہو۔ پھر یہ بھی کہ چھوٹے چھوٹے عام سے لفظوں میں بڑی بات کہہ دیتے ہیں۔ اتنی بڑی کہ غوطے لگاتے رہو۔ ویسے نہ لگاؤ تو بے شک خالی اُوپر ہی اُوپر تیرتے رہو۔

میں جانوں بات میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ خدوخال کی بناوٹ سجاوٹ سے کہیں زیادہ۔ نتیجہ یہ کہ ڈیڈی کے گرد جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ یونیورسٹی میں بھی، گھر پر بھی۔ نوجوان کھچے چلے آتے ہیں۔ لڑکے کم کم، لڑکیاں زیادہ۔ لڑکوں میں ذہنی لگاؤ پیدا ہوتا ہے، لڑکیوں میں جذباتی۔ ڈیڈی راجا اندر بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ ممی کہتی ہیں: ان کے افیئرز چلتے ہیں۔ پتا نہیں۔ شاید چلتے ہوں۔ لیکن جیسے اتنی واہ واہ ملے، سُننے والے مبہوت ہو کر رہ جائیں، وہ پھر افیئر سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بہرحال، یہ تو ہے کہ لڑکیاں ڈیڈی پر مرتی ہیں محبت کے بھبھاکے ضرور اُٹھتے ہیں۔ منظر بھیگا بھیگا ہوتا ہے۔ اوس چاہے پڑے نہ پڑے۔ اور پڑ بھی جائے تو کیا مضائقہ۔ ڈیڈی بھی تو بڑے امینسی پیٹڈ ہیں۔

یہ امینسی پیٹڈ محبت مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔ یوں دِکھتی ہے جیسے گائے بھینسوں جیسی ہو۔ یہ محبت تو کی جاتی ہے، ہوتی نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے محبت ہو جائے۔

کردں نہیں، ہو جائے۔ ایسی ہو جائے کہ جی چاہے اس بندھن سے چھوٹ جاؤں۔ لیکن چھٹنا محال ہو جائے۔ جان عذاب میں پڑ جائے۔ پتا نہیں میرا جی ایسا کیوں چاہتا ہے؟

میرے گھر والے، ممی، ڈیڈی، میرا سارا ماحول، سکول، سہیلیاں، کزن، مجھے ترغیب دیتے رہتے ہیں کہ محبت کر۔ کرنے والی محبت کر، اور جی۔

ساری مغربی تہذیب عورتوں کو اسی بات پر مائل کرتی رہتی ہے کہ اُٹھ، محبت کر، اور جی۔ یہی زندگی ہے۔ یہی خوشی ہے۔ یہی سب کچھ ہے۔ اہلِ مغرب سبھی اسی چکّر میں پڑے ہُوئے ہیں۔ کرنے والی محبّت میں لت پت ہو رہے ہیں۔ محبوبوں کے کیو لگے ہُوئے ہیں۔ کسی کا دسواں محبوب ہے، کسی کا پندھرواں۔ محبُوب یوں بدلتے ہیں جیسے جُرابیں ہوں۔ پُرانی ہو گئیں تو پھینک کر نئی لے آئے۔ کہتے ہیں، یہ آزادی ہے۔ آزادی تو ہے، پر محبّت نہیں۔ محبّت تو خود ایک بندھن ہے۔ ایسا بندھن جس سے آزاد ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ اور جی چاہے بھی تو آزاد ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

دیکھ لو، کرنے والی محبّت اور آزادی نے مغرب کو کیا کر دیا ہے۔ نہ محبّت کی توقیر رہی ہے، نہ عورت کی، نہ رشتوں کی۔ بندھن ٹُوٹ گئے ہیں۔ زندگی سے دل اُچاٹ ہو گئے ہیں۔ آوارہ گھومو۔ نشہ کرو۔ خوش وقتی۔ تفریح۔

تفریح تو وقتی چیز ہے۔ جو لوگ تفریح کے پیچھے دوڑتے ہیں، وہ خود وقتی بن جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ تفریح میں ادل بدل کے بغیر بات نہیں بنتی۔ تفریح کی سڑک پر چہل قدمی کرو تو بھر پور ہو کر سڑک چھوڑ کر پگ ڈنڈیوں پر چڑھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کرنے والی محبّت ایسی ہی اک تفریح ہے۔

ہٹئے! ہو جانے والی محبّت کی کیا بات ہے۔ اُدھر نکڑ پر جو پھلوں کی ریڑھی لگاتا ہے نا۔ کیا نام ہے اس کا، حمیدا۔ ہو گا تیس پینتیس کا۔ جب گیارہ بجتے ہیں تو وہ اپنی ریڑھی چھوڑ کر ہمارے گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ چاہے کڑکتی دھوپ ہو یا

بارش ہو رہی ہو۔ دروازے پر کھڑا رہتا ہے۔ کھڑا رہتا ہے۔ اس وقت اسے نہ گاہک کی پروا ہوتی ہے، نہ بکری کی۔ ہمارے گیٹ کے مقابل جو گلی ہے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ دیکھتا رہتا ہے۔ پھر وہ خاتون گلی سے باہر نکلتی ہے۔ بس بُت بنا اسے دیکھتا رہتا ہے۔ اسے بُلاتا نہیں۔ کھنکورا نہیں مارتا، کہ اِدھر دیکھ، میں تیری راہوں میں کھڑا ہوں۔ نہ نہ۔ بالکل نہیں۔ اس کا پیچھا نہیں کرتا۔ بس چپ چاپ اُداس نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔

وہ اللہ کی بندی بھی چُپ چاپ سمٹی سمٹائی گزر جاتی ہے۔ نگاہ اُوپر نہیں اُٹھاتی۔ اس کی چال میں ٹھمک تک پیدا نہیں ہوتی۔ شاید اسے احساس ہی نہیں کہ کوئی روز بلا ناغہ اسے دیکھنے کے لیے راہ میں کھڑا رہتا ہے۔ لیکن نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اسے محبت بھری نظروں سے دیکھے اور عورت کو پتا ہی نہ چلے۔ ضرور اسے پتا ہوگا۔ پھر بھی وہ لپٹی لپٹائی یوں گزر جاتی ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ہوتا ہوگا۔ ضرور ہوتا ہوگا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں پتا نہیں کیا کیا ہوتا ہوگا۔ میں جانوں، بھری ہوتی ہے پر چھلکتی نہیں۔ وہ تو کرنے والی محبت ہوتی ہے جو چھلکتی ہے۔ بھری نہیں خالی چھلکتی ہے۔ صرف چھلکن ہی چھلکن۔ پھر وہ غلام علی کی بات۔

ہٹے! کیا بات تھی غلام علی کی بات کی۔ سُن کر میں دو دِن سُن رہی تھی۔

غلام علی کی بات چچا شیر محمد نے سنائی تھی۔ جب ورلڈ وار ختم ہوئی تھی تب کی بات ہے۔ ان دنوں ہندوستانی رجمنٹ کا ایک یونٹ فرانس کے ایک گاؤں کے قریب مقیم تھا۔ اس یونٹ میں سارے جوان جہلمی تھے۔ ان میں غلام علی بھی تھا۔ اُونچا لمبا شیس جوان۔

غلام علی کو گاؤں کی ایک فرانسیسی دوشیزہ سے محبت ہو گئی۔ پھر غلام علی کا معمول ہو گیا کہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر شام کے وقت اس لڑکی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ کھڑا رہتا، کھڑا رہتا۔ چاہے بُوندا باندی ہو رہی ہوتی یا موسلا دھار بارش پڑ رہی ہوتی۔ وہ وہاں کھڑا رہتا۔ طوفان آتے، برف باری ہوتی، لیکن غلام علی وہاں کھڑا رہتا۔

غلام علی تب تک وہاں کھڑا رہتا جب تک اتفاق سے دوشیزہ کھڑکی میں نہ آ کھڑی

ہوتی۔ اسے دیکھ کر غلام علی اٹینشن ہو کر اسے سلوٹ مارتا۔ جب تک وہ سامنے کھڑی رہتی، سلوٹ کیے کھڑا رہتا۔ چلی جاتی تو وہ اپنے یونٹ کی طرف چل پڑتا۔

گاؤں والے غلام علی کو وہاں کھڑا دیکھ کر حیران ہوتے کہ یہ جوان یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے۔ گاؤں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ پھر جب، انھیں پتا چلا کہ اسے فرانس کی بیٹی ماریانہ سے محبّت ہے تو وہ اور بھی حیران ہوئے۔ یہ کیسی محبّت ہے کہ مکان کے سامنے کھڑے رہے کہ محبوبہ سامنے آئے تو اسے سلوٹ ماریں! جو محبت ہے تو محبوبہ کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ اندر جاؤ۔ اس کا ہاتھ چومو۔ پاس بیٹھو۔ فرانس والوں کو بھلا کیا پتا تھا کہ ہو جانے والی محبّت کیا ہوتی ہے۔ وہ تو بس کرنے والی محبّت کو جانتے تھے۔

جب ماریانہ کے باپ کو پتا چلا تو وہ غصّہ کھا گیا۔ بولا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے تو اسے اندر بلاؤ۔ اس کی خاطر تواضع کرو۔ پاس بٹھاؤ۔ اس کی دل جوئی کرو۔"

اس پر ماریانہ کا بھائی دوڑا دوڑا غلام علی کے پاس گیا۔ بولا "آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ اندر آئیے۔ ماریانہ کے پاس بیٹھیے۔"

اس پر غلام علی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بولا "میں اندر جاؤں، ماریانہ کے پاس بیٹھوں؟— میں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" یہ جان کر گاؤں والے بے حد حیران ہوئے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔

ماریانہ تو یہ سُن کر حیرت سے تصویر بن کر رہ گئی۔ مائی گاڈ! یہ کیسی محبت ہے، جس کا مقصد مجھے دیوی بنا کر پُوجا کرنا ہے، اور بس۔ اس کے اندر ایک طُوفان اُٹھا۔ ایسا طُوفان جو پہلے کبھی نہ اُٹھا تھا۔ چھم چھم آنسو بہنے لگے۔ وہ آنسو خوشی کے آنسو تھے۔ اس کے دل میں ایک اَن جانا مان بیدار ہوا، جو اس کے انگ انگ میں رچ گیا۔ اور اس مان نے اسے گاڈس بنا دیا۔

پھر جب غلام علی کے یونٹ نے وہاں سے کوچ کیا تو غلام علی سب سے پیچھے تھا۔ اس کا منہ گاؤں کی طرف تھا۔ اور وہ اُلٹے پاؤں چل رہا تھا، جیسے کسی درگاہ سے باہر نکلتے ہیں۔ اور اس کا ہاتھ مسلسل سلوٹ میں تھا۔ ادھر ماریانہ سڑک پر نکل آئی تھی اور مسلسل ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہ رہی تھی۔ اس کے پیچھے سارے گاؤں والے آنسو بہا رہے تھے۔ گاؤں کی گوریاں ہچکیاں لے رہی تھیں کہ کاش! ہماری زندگی میں بھی کوئی غلام علی آتا۔

ہینے! میں بھی سوچتی ہوں کہ میری زندگی میں بھی ـــــــ ہائیں! یہ کیسی آواز ہے ـــــ ذرا ٹھہرو ـــــــ ہاں، وہی ہے، وہی ـــــ اس کے سائیکل کی آواز سن کر پتا نہیں کیا ہوتا ہے۔ میں چونک جاتی ہوں۔ ویسے سامنے کی سڑک پر بیسیوں سائیکل گزرتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پتا نہیں اس کے سائیکل کی آواز میں کیا بات ہے کہ میں چونک جاتی ہوں۔ ہمارے مالی کا بیٹا ہے۔ پڑھ رہا ہے۔ ویسے کبھی کبھی اس کا ابا اسے ہمارے گھر میں کام کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ عام سے خد و خال ہیں، جیسے ہوتے ہیں لڑکوں کے۔ ہاں ہونٹ ـــ ہونٹوں نے ایسی چٹکی سی بھر رکھی ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی لطیفہ سنا ہو۔ اس کے ہاتھ ذرا بھی آرٹسٹک نہیں۔ موٹے بھدّے۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔ جب وہ کٹائی کا کام کر رہا ہوتا ہے تو میں چوری چوری اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔

بہانے بہانے میں اسے اپنے کمرے میں بلا لیا کرتی ہوں۔ اسی لیے تو میں نے اپنے کمرے میں تین گملے سجا رکھے ہیں۔ ایک پام کا، ایک کیکٹس کا اور ایک مشروم کا۔ جب وہ اندر آتا ہے تو سارا کمرا اس کی خوشبو سے بھر جاتا ہے۔

جب میں اس سے بات کرتی ہوں تو وہ نظریں جھکائے رکھتا ہے۔ جب میں کسی اور طرف دیکھتی ہوں تو وہ مجھے دیکھتا ہے۔ دیکھتا رہتا ہے۔ دیکھتا رہتا ہے۔ میں جان بوجھ کر، جھوٹ موٹ، دوسری طرف دیکھتی رہتی ہوں۔

مائی گاڈ! جب وہ میری طرف دیکھتا ہے تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے غلام علی سلوٹ مارے کھڑا ہو۔

اس وقت میرے دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے۔ وہ کچھ کچھ طوفان بن کر میرے انگ انگ میں رچ جاتا ہے۔ ایک مان انگڑائی لیتا ہے۔ ایک تفاخر ـــــ ایک پھلجھڑی سی چل جاتی ہے۔ اور، اور مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی نگاہوں نے مجھے دیوی بنا دیا ہو۔

گرین ما

یا اللہ! تُو نے مجھے کتنے بھاگ لگائے ہیں۔ کتنا سوہنا گھر ہے یہ۔ کتنا بنا سجا ہُوا ہے۔ ایسا ایسا سامان لگا ہے۔ کیسے کیسے غالیچے ہیں۔ صوفے ہیں۔ کرُسیاں ہیں۔ کیسی کیسی سجاوٹیں لگی ہوئی ہیں۔ دیواریں ہی دیکھو، روغن سے لشک رہی ہیں۔

ہاتھ لگانے سے میلا ہوتا ہے یہ گھر۔ نہ، میں تو ہاتھ نہیں لگاتی۔ میں تو کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ میں کیوں چیزوں کو میلا کر دوں۔ خوامخواہ۔ بس چیزوں کو دیکھتی ہوں، سامان کو دیکھتی ہوں۔ اللہ کی شان ہے!

کل مُنّی کہہ رہا تھا "گرینی، اس ٹیپ رکاٹ کو ہاتھ نہ لگانا۔ نہ نہ۔ جو ہاتھ لگاؤ تو یہ خراب ہو جاتا ہے۔ سمجھی گرین ما؟" وہ مجھے سمجھاتا رہتا ہے: گرینی یہ نہیں کرنا، وہ نہیں کرنا۔ یُوں کرو تو یُوں ہو جاتا ہے۔ وُوں کرو تو وُوں ہو جاتا ہے۔ وہ خود سارا دن ٹیپ رکاٹ سے کھیلتا رہتا ہے۔ اسے پتا ہے نا۔ اسے سب چیزوں کا پتا ہے۔ یہ بٹن دباؤ تو ٹیپ رکاٹ بولتا ہے۔ یہ دباؤ تو چُپ ہو جاتا ہے۔ اور مجھے تو کچھ بھی پتا نہیں۔ میں کیوں لگاؤں ہاتھ؟

پھر اسمی کہا کرتی ہے "گرین ما، تیرے ہاتھ کیسے ہیں، جیسے ہڈیوں پر ڈھیلا غلاف چڑھا ہو"۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔ اب تو ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ ہڈیاں اور میلی میلی جھریاں۔ اتنے میلے ہیں میرے ہاتھ کہ میں انھیں چھپائے پھرتی ہوں۔ پتا نہیں اتنے میلے کیوں لگتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے پانچ دفعہ دھوتی ہوں۔ پاک کرتی ہوں۔ پاک تو ہو جاتے ہیں پر رہتے میلے ہی ہیں۔

اسمی کہتی ہے "گریبی، کسی کھانے والی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا کرتے، ہاں۔ گلاس نیچے سے اُٹھاتے ہیں، اُوپر سے نہیں۔ چیز چمچے سے ڈالتے ہیں، اُنگلی سے نہیں۔ سمجھی گریبی؟"

اُس روز جب میں کچن میں پیڑھی پہ بیٹھی روٹی کھا رہی تھی تو اسمی کتنی ناراض ہوئی تھی۔ "ہئے! گریبی۔ روٹی پر سالن؟ ایسا نہیں کیا کرتے۔ روٹی پر سالن نہیں ڈالا کرتے۔ سالن پلیٹ میں ڈالو۔ روٹی دوسری پلیٹ میں رکھو۔ ڈائننگ میز پہ بیٹھو۔ پھر کھاؤ۔ ہاں۔"

اب میں کیا کروں؟ روٹی پر سالن ڈالنے کی پُرانی عادت جو ہوئی۔ اور پھر میز پر بیٹھ کر کھانے کی مجھے عادت نہیں نا۔ مجھے اوپرا اوپرا لگتا ہے۔ نہ، میں نہیں میز پہ بیٹھتی۔ جبھی تو چوری چوری روٹی کھاتی ہوں، کچن میں بیٹھ کر، کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ پر کبھی کبھی پکڑی جاتی ہوں نا۔ پھر بچے مجھ سے لڑتے ہیں "گریبی، تم چور ہے کیا؟ پھر چھپ چھپ کر کیوں کھاتی ہے روٹی؟" لو، میں کیا چور ہوں۔ یہ میرے بیٹے کا گھر ہے۔ میرا پیٹ جایا۔ میرا اپنا صفی۔ میرے جگر کا ٹکڑا۔

اللہ اسے اور مرتبہ دے۔ اور بڑا بنگلہ دے۔ اور سامان دے، لشک پشک کرتا سامان۔ مجھے کتنی خوشی ہے۔ اللہ نے میرے صفی کو کتنے بھاگ لگائے ہیں۔ جم جم جیوے جوانیاں مانے۔

پھر وہ بڑی لڑکی ہے، سیما۔ یوں توری کی طرح نکلی ہے کہ حد نہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو گئی ہے۔ بُوٹا سا قد، اور ایسی چھب کہ دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ یوں پتلی پتنگ اُونچی لمبی جیسے ترہوتر۔ ٹپ ٹپ چلتی ہے جیسے میم ہو میم۔ بس مُنھ پہ ماس نہیں آیا۔ پتا نہیں آجکل منھ پہ ماس کیوں نہیں آتا! ہمارے زمانے میں نو جوان لڑکی بیٹھتی تھی تو پیڑھی لبالب بھر جایا کرتی تھی۔ مُنھ کی طرف دیکھتے تو گال اُبھرے اُبھرے ہوتے اور پھر لال جیسے سیب ہوں۔ آجکل تو پچکے ہوتے ہیں، اور اللہ ماری زردی ہی زردی، جیسے مُنھ پہ سرسوں کا

کھیت اُگا ہو۔ سیما بیٹھتی ہے تو کرسی بھی نہیں بھرتی۔ خالی خالی رہ جاتی ہے۔ اومنوں! ـــــ بیٹھے نہیں سیما کو تو چلتے دیکھو، یا جب ڈانس کر رہی ہو۔ میرا تو جی خوش ہو جاتا ہے دیکھ کر۔ اتنی جان ہے اس میں کہ کوئی حد نہیں۔ جیسے بجلی بھری ہوئی ہو۔ اللہ عمر دراز کرے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ بیٹھ کر اس سے باتاں کروں۔ پر وہ بیٹھے بھی۔ جو بیٹھ بھی جائے تو ٹانگ چلتی رہتی ہے۔ ٹانگ نہیں تو پاؤں ہی چلتا ہے۔ یوں جیسے انڈا پھینٹتے ہوئے چمچ چلتا ہے۔

چلو، اگر سیما بیٹھ بھی جائے تو میں بات کیسے کروں؟ کوئی بات بھی کروں تو پتا ہے کیا کہتی ہے؟ کہتی ہے "گرین ما، آپ سمجھتی نہیں"۔ چاہے موسم کی بات کروں، گاڑی کی بات کروں یا مکھن کی، بس یہی کہتی ہے "گرین ما، آپ نہیں سمجھتیں"۔ پھر بے چاری مجھے سمجھاتی رہتی ہے۔ مجھے نہیں آتی سمجھ۔ آجکل کوئی بات بھی سیدھی نہیں ہوتی۔ ہر بات میں بل۔ ہر بات میں کنڈلی مارے بیٹھی ہے۔ میری سمجھ میں کیسے آئے بھلا!

ایک وہ زمانہ تھا جب میں سب کچھ سمجھتی تھی۔ گاؤں میں کوئی بات بھی ہوتی، عورتیں کہتیں "ہئے! اب کیا کریں؟ پتا نہیں یہ بات کیسے کی جاتی ہے؟ مناسب کیا ہے؟"

پھر کوئی نا کوئی بول اُٹھتی "چلو، ماسی مہراں سے پوچھ لیں"۔ پھر وہ سب میرے گھر آجاتیں۔ کہتیں "ماسی، یہ بتا کہ یہ بات کیسے کی جاتی ہے؟ مثلاً منگنی کے لیے سوالی بن کر جانا ہو تو ساتھ کس کس کو لے جائیں، یا جب پنچایت لگے تو پنچوں کو گڑ کا شربت پلائیں یا دودھ؟"

اُن دنوں گاؤں والیاں سمجھتی تھیں کہ میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ اب صفی کے گھر میں ہر کوئی کہتا ہے "گرین ما، تو نہیں سمجھتی"۔ ممی بھی یہی کہتا ہے، ایمی بھی یہی کہتی ہے، سیما بھی، بہو بھی۔ خود صفی کہتا ہے "اماں نہیں سمجھے گی، اس بات کو"۔

ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ ساری چیزیں ہی بدل گئی ہیں۔ باتیں بدل گئی ہیں۔ سبھی کچھ بدل گیا ہے۔ پرانی باتیں تو رہی ہی نہیں۔ اماں بھلا کیسے سمجھے۔

کل سیما کہہ رہی تھی "گرین ما، ڈور بل بجا کرے تو آپ نہ جایا کریں، دروازے پر بزیٹر

گھبرا جاتے ہیں، دیکھ کر۔ اس میں ہماری بدنامی ہے۔ گرین ما، آپ سمجھتی کیوں نہیں؛ یہ تو نوکر کا کام ہے۔ نوکر خود جائے گا، دیکھنے۔"

وہ تو مجھے پتا ہے کہ یہ نوکر کا کام ہے۔ پر کسی وقت صوبہ ہانڈی بھون رہا ہوتا ہے۔ بے چارہ دروازے پر کیسے جائے۔ پھر میں اسے کہتی ہوں "صوبے پتّر، تو کام کر۔ میں دیکھ لیتی ہوں کہ کون ہے۔" چلی تو جاتی ہوں میں دیکھنے، پر سیما کہتی سچ ہے۔ مہمان مجھے دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔

پھر سیما یہ بھی تو کہتی ہے۔ کہتی ہے "گرین ما، نوکروں کے ساتھ اس طرح نہیں بولا کرتے۔ صوبہ تو نوکر ہے، پتّر نہیں۔ گرین ما، آپ کیوں نہیں سمجھتیں؟ اس طرح نوکر بگڑ جاتے ہیں ـــــ" شاید سچ کہتی ہو سیما۔ پر بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ لو بھلا، کسی کو پتّر کہنے سے وہ بگڑ جاتا ہے کیا؟

گاؤں میں تو میں سب کو پتّر کہا کرتی تھی۔ کوئی بھی نہ بگڑا تھا۔ اُلٹا سارے ہی بی بی کہتے پھرتے تھے۔ پر وہ گاؤں تھا نا۔ یہ شہر ہوا۔ گاؤں کی بات اور ہوتی ہے، شہر کی اور ہوتی ہے۔ مجھے کیا پتا شہر کی بات کیا ہوتی ہے۔ ضرور سیما سچ کہتی ہوگی۔ اسے کیا پڑی کہ جھوٹ بولے۔ سیما ہی نہیں، بہو خود کہتی ہے "اماں جی، آپ نوکروں کے ساتھ گھُل مِل کر نہ بیٹھا کریں۔"

میں گھُل مل کر تو نہیں بیٹھتی۔ ویسے کبھی دیہڑے میں اکیلی پڑے پڑے گھبرا جاتی ہوں تو بسرچی خانے چلی جاتی ہوں۔ بسرچی خانے جاؤں تو وہاں صوبہ ہوتا ہے۔ پھر بات تو کرنی ہی پڑتی ہے، کوئی نا کوئی نا۔ اب یہ تو نہیں ہوتا نا کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ رہو۔

صوبہ بے چارا بڑا ہی اچھا ہے۔ میری بڑی عزّت کرتا ہے۔ پہلے پہل مجھے بڑی بیگم صاحبہ کہا کرتا تھا۔ لو، میں بیگم ہوں کیا؟ خوامخواہ۔ بیگم تو وہ ہوتی ہے جو بیگم ہوتی ہے۔ میں بھلا کدھر سے بیگم ہوئی۔ خوامخواہ۔ بہو تو ہوئی نا بیگم۔ چلنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا، بولنا، سب

بیگم کا سا ہے۔ جب وہ آواز دیتی ہے" صادُبا" تو آواز سے ہی پتا چلتا ہے کہ بیگم بول رہی ہے۔ کہتی ہے "صادُبا، لنچ پر شامی بنا لو، ساتھ دال اور کریلے گوشت۔ اور ڈنر پر چکن ہو، چاول ہوں، کوئی سا میٹھا۔ اور دیکھو، کریلے پہلے اُبال لینا۔ کسیلے نہ ہوں"۔ "بہت اچھا، بیگم صاحبہ" وہ بولتا ہے۔ پھر بیگم رُکتی نہیں۔ یہ جا وہ جا۔ صوبے سے زیادہ بات نہیں کرتی۔ کام بتایا اور گئی، جیسے بیگم کو کرنا چاہیے۔

اے، روز تو دیکھتی ہوں بیگمیں۔ بنی سجی ہوئی آتی ہیں۔ مُنھ گول کر کے بولتی ہیں۔ بولتی اُردو میں ہیں، پر یُوں لگتا ہے جیسے انگریجی بول رہی ہوں۔

تو میں نے کہا" صوبے، مجھے بیگم نہ کہا کرو۔ میں کدھر سے بیگم ہُوں بھلا؟"

"تو پھر کیا کہا کروں، بڑی بیگم صاحبہ؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا" تُو مجھے بی بی کہہ لیا کر۔"

اب وہ مجھے بڑی بی بی کہتا ہے۔ بڑا اچھا ہے، بے چارہ۔ میری ساری باتیں سُنتا ہے۔ کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ نہیں سمجھتیں، بڑی بی بی۔ وہ سمجھتا ہے، میں سب سمجھتی ہوں۔ اس کے ساتھ باتیں کرتی ہُوں تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں پھر سے گاؤں آگئی ہوں۔

اُس نے کبھی نہیں کہا کہ بڑی بی بی، سالن روٹی پر نہ ڈالیں۔ کبھی نہیں کہا کہ بی بی، روٹی پلیٹ پر رکھ لیں۔ یا پیڑھی پر نہ بیٹھیں، میز پر بیٹھیں۔ اس نے مجھے کبھی نہیں کہا کہ بڑی بی بی، آپ کچن میں نہ بیٹھا کریں۔

حالانکہ بیگم نے کئی بار صوبے سے کہا ہے "صادُبا، بڑی بیگم صاحبہ کو اپنے پاس مت بٹھایا کر۔ بُری بات ہے"۔ پر اُس نے مجھے کبھی نہیں جتایا۔ وہ تو میں نے آپ بیگم کو کہتے ہُوئے سُن لیا تھا، اس لیے مجھے پتا ہے۔

میں تو کبھی باورچی خانے نہ جاؤں۔ میں بھلا صوبے کو بیگم کی نظروں میں کیوں بُرا بناؤں۔ پر کیا کروں کسی وقت جی چاہتا ہے کہ کسی سے بات کروں، کسی کے پاس بیٹھوں۔ کس کے

پاس بیٹھوں؟ سارے ہی اپنے اپنے کمرے میں بند رہتے ہیں۔ پتا نہیں یہ آج کل کے لوگ کمروں میں بند کیوں رہتے ہیں؟ مل کر ایک جگہ بیٹھتے ہی نہیں۔

میں تو سارا دن کھلے وہڑے میں منجی پر پڑی رہتی ہوں۔ پڑے پڑے اُکتا جاتی ہوں تو صوبے کے پاس جا بیٹھتی ہوں۔ کیا کروں؟

سارے گھر میں تین ہی بیڈ روم ہیں نا۔ ایک میں صفی اور بیگم سوتے ہیں۔ دُوسرے میں ٹمی اور اسمی۔ اور تیسرے میں اکیلی سیما۔

جب میں نئی نئی آئی تھی تو صفی نے کہا تھا "اماں کا پلنگ سیما کے کمرے میں لگا دو۔" دو دن تو میں سیما کے ساتھ سوتی رہی، پھر تیسرے دن بڑی دیر تک صفی، بیگم اور سیما ایک کمرے میں بیٹھے باتاں کرتے رہے۔ پھر صفی آیا، کہنے لگا "بھئی، اماں تو اس کمرے میں گھٹی گھٹی سی رہتی ہے۔ اس کی عادت تو کھلی جگہ میں رہنے کی ہے۔ بھئی، اس کی چار پائی تو ریسپشن میں لگا دو۔ کیوں، اماں؟"

لو، میں بھلا کیا کہتی۔ ٹھیک ہی تو کہ رہا تھا، صفی۔ مجھے تو کھلی جگہ میں رہنا پسند ہے۔

تو انھوں نے میری منجی ریسپشن میں لگا دی۔ اے، وہی جو دلان سا ہے، کمروں سے باہر۔

دوسرے دن ہی بیگم نے کہا "صادُ با، جب بڑی بیگم صبح اُٹھ کر نماز پڑھیں نا، تو تم ان کی منجی اُٹھا دیا کرو۔ اور جب رات کو یہ عشا کی نماز پڑھ لیا کرو تو بچھا دیا کرو۔"

ہاں بھئی، ٹھیک تو ہے۔ سارا دن منجی ریسپشن میں بچھی رہے تو اچھی نہیں لگتی نا۔

اور میرا کیا ہے، میں سارا دن پچھلے وہڑے میں ہتھ پکھی لے کر پڑی رہتی ہوں۔ کھُلی جگہ ہے۔ بڑی سوہنی ہوا آتی رہتی ہے۔ اور جو اکیلی پڑی گھبرائی تو صوبے کے پاس جا بیٹھی۔ ٹمی، اسمی کے پاس جا بیٹھی۔ دن گزر ہی جاتا ہے۔

شکر ہے اللہ کا۔ بڑا سوہنا وقت گزرتا ہے۔ اے، اتنا بھرا بھرا گھر ہے اللہ رکھے۔ پوتے ہیں، پوتیاں ہیں۔ بہو ہے، بیٹا ہے۔ اور پھر گھر اتنا سوہنا ہے، اتنا صاف ستھرا، کہ ہاتھ لگاؤ تو میلا ہو جائے۔ مجھے بھلا اور کیا چاہیے۔ اللہ نے اتنے بھاگ لگائے ہیں مجھے۔ اللہ رکھے میرا پُتّر صاب بنا ہُوا ہے، صاب۔ سبھی صاب کہ کر بلاتے ہیں۔ اللہ نے اتنا مرتبہ دے رکھا ہے۔ اللہ اس سے بھی بڑا مرتبہ دے۔

اور پھر وہ میرا اتنا خیال رکھتا ہے کہ ہر دُوسرے تیسرے دِن خود آتا ہے، میرے پاس۔ کہتا ہے "اماں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔ تجھے کوئی تکلیف تو نہیں، اماں؟" اتنا خیال رکھتا ہے میرا پُتّر۔ میں کتنی خوش نصیب ہُوں۔ اس سے زیادہ خوش نصیبی کیا ہو گی بھلا۔ اللہ نے اتنے بھاگ لگائے ہیں مجھے۔ پھر میں کیوں نہ خوش ہُوں؟ ______

میں کوئی ناشکری ہُوں کہ ______ نہیں نہیں۔ میں بہت خُوش ہوں۔ بہت خُوش۔

علیٰ اور عفریت

زندگی کا عظیم ترین واقعہ، چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

ایک چھوٹا سا چشمہ پھوٹتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شوریدہ سر دریا بن کر آپ کی شخصیت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔

وہ اچانک رُونما ہوتا ہے، ایسے وقت جبکہ نہ خواہش ہوتی ہے نہ آرزو، نہ اُمید نہ توقع۔ آپ دروازے بند کر چکے ہوتے ہیں۔ اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ جب آپ بھرپور زندگی بتا چکے ہوتے ہیں، خود سے مطمئن تکمیل کے احساس سے سرشار۔

اس وقت وہ اچانک رُونما ہوتا ہے اور آپ کی شخصیت کے اس شاندار ایوان کو جسے آپ نے سال ہا سال ایک اینٹ رکھ کر تعمیر کیا تھا، ایک جھٹکے میں مسمار کر دیتا ہے۔

اور پھر جب آپ دیکھتے ہیں تو ـــــــ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

میں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی۔ جوانی میں جذبات کی ایک بھیڑ لگائے رکھی۔ میلہ لگائے رکھا۔ پٹاخے چھوڑے، پھلجھڑیاں چلائیں، ہولیاں کھیلیں، رنگ پچکاریاں چلائیں ابیر گلال کے تھال بھرے۔

میں جذباتی تھا، شدت پسند تھا۔ جذبات اور شدت میری دانست میں خلوص کے مظہر تھے۔ میرا رُخ مثبت تھا، خلوص بھرا، ہمدردی بھرا، حقارت اور نفرت سے پاک۔ میں کر دینے والا تھا۔ گو نگے اور ٹھنڈے خون والے مجھے پسند نہ تھے۔

میں نے علم حاصل کیا تھا۔ نفسیات میں مجھے دسترس تھی۔ تحلیلِ نفسی میں خاص اہلیت تھی۔ دوست مانتے تھے۔ اچھا جانتے تھے۔ قدر کرتے تھے۔

اپنے ماضی پر مجھے کوئی پشیمانی نہ تھی۔ نہ احساسِ گناہ، نہ کمتری۔

میں نے عشق کیے، محبتیں کیں۔ افیئرز نہیں۔ یارانے نہیں۔ توجہ کا بنا۔ رہا۔ ذلتیں اور رسوائیاں جھیلیں۔ فراق و وصال سبھی کچھ۔ جبھی تو اب خود سے مطمئن تھا۔ احساسِ تکمیل سے سرشار۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے: بول کیا مانگتا ہے؟ جو مانگے گا ملے گا۔ تو یقیناً میں سوچ میں پڑ جاؤں گا۔ کیا مانگوں؟ میں مانگ کی دنیا سے دور نکل آیا ہوں۔ سکون اور اطمینان کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔

شور شرابا پیچھے رہ گیا ہے، بہت پیچھے۔

جس راستے پر میں گام زن ہوں، وہ اطمینان سے لبریز ہے۔

سڑک خاموش ہے۔

راستہ ہموار ہے نہ اوچان نہ نچان۔ سیدھا، صاف۔ دونوں جانب پیڑ اُگے ہوئے ہیں۔ سرسبز نہیں، پیلے پیلے۔ اُونچے لمبے نہیں، بیٹھے بیٹھے، جھکے جھکے، گرد آلود۔

پتے مسلسل جھڑ رہے ہیں۔ کھڑ کھڑ کر رہے ہیں۔

شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔

دُور دُور لگے کھمبوں پر بتیاں ٹمٹما رہی ہیں۔

ان کی زرد ٹم ٹم زمین تک نہیں پہنچ پاتی۔

شام کا گھسپھسہ بڑھتا جا رہا ہے۔

سڑک پر اکا دکا راہ گیر چل رہے ہیں۔

چپ چاپ۔ تھکے ہارے۔ گرد سے اٹے ہوئے۔

ایک دوسرے سے دُور دُور۔ اکیلے اکیلے۔ تنہا تنہا۔

منظر پر سکون کا ایک خیمہ تنا ہُوا ہے۔ بے چینی کی مدہانی مدّت سے زنگ آلود ہو چکی ہے۔ میرے دل میں کوئی مدّو جزر نہیں۔ ذہن سوچ بچار کی گھاٹیوں سے نکل چکا ہے۔ کیوں، کیسے، کس لیے کے بِھڑ بھُن بھُن کرنا بھُول چکے ہیں۔

میرے سامنے آسمان پر چاند ٹنگا ہُوا ہے۔ چاندنی والا چاند نہیں۔ چاندنی تو بکھیر دیتی ہے۔ ایک بڑا سا مدّھم مدّھم چاند۔ جیسے تانبے کا ایک تھال لٹک رہا ہو۔ میں چلے جا رہا ہُوں، چلے جا رہا ہُوں۔

دفعتہً پاؤں کی چاپ سُنائی دیتی ہے۔ قریب، اور قریب۔ یہ کون ہے جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے؟

میں مُڑ کر دیکھتا ہُوں: کون ہو تُم؟

وہ سر اُٹھاتی ہے۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھکتی ہے۔ رُکتی ہے۔ پھر سر جُھکا لیتی ہے۔ جواب نہیں دیتی۔

اس کے جسم میں چمک ہے، تازگی ہے، شگفتگی ہے۔ لیکن مُنھ لٹکا ہُوا ہے۔ خدوخال پر بے تکلّفی کی دھول جمی ہے۔ تھکا ہارا مُردہ چہرا۔ گردن جُھکی ہُوئی۔ نگاہیں اُکتائی ہوئی، جیسے بہُت کچھ دیکھا ہو، دیکھ دیکھ کر تھک گئی ہوں، جُھک گئی ہوں۔ نہ دیکھنے کی چاہ نہ دکھانے کا شوق۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟ کون ہو تُم؟"

"میں بھی ہوں" وہ سر اُٹھائے بغیر جواب دیتی ہے۔

جواب میں تلخی ہے۔ لیکن آواز مدّھم، پھٹی پھٹی، تھکی تھکی۔ اس میں چمک نہیں۔ تان نہیں۔ لے نہیں۔ لوچ نہیں۔ جیسے ریوڑی بھیگ گئی ہو۔ کڑاکا نہ رہا ہو۔

"لیکن یہ سڑک تو تمھارے لیے نہیں ہے۔ تمھیں تو شاہراہ پر چلنا چاہیے، جہاں

رونق ہے، نہ زندگی ہے۔"

"وہیں سے آئی ہوں" وہ جواب دیتی ہے۔

"لیکن کیوں؟" ناگاہ میرے منھ سے نکل جاتا ہے۔

وہ سر اُٹھاتی ہے۔ تن کر کھڑی ہو جاتی ہے "میری مرضی۔"

میں چُپ ہو جاتا ہوں۔ چلنے لگتا ہوں۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ لیکن دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ پتا نہیں غصّہ ہے یا کیا۔

پاؤں کی چاپ پھر قریب آجاتی ہے۔ اور قریب۔

"تم میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہی ہو؟" ان جانے میں میرے منھ سے نکل جاتا ہے۔

"ساتھ نہیں۔ میں چل رہی ہوں" وہ باآواز بلند کہتی ہے۔ پھر زیرِ لبی سنائی دیتی ہے "کوئی کسی کے ساتھ نہیں چلتا۔" اس کی آواز میں حسرت نہیں، آرزو نہیں، بے تعلقی ہی بے تعلقی ہے۔

میں رُک جاتا ہوں "دیکھو تو، پاؤں دھیرے دھرو۔ ہم ساتھ ساتھ نہ رہیں۔"

"ہاں" وہ کہتی ہے "دھیرے دھرے تھے۔ لیکن۔"

"لیکن کیا؟" میں پوچھتا ہوں۔

"پھر تم بھی پاؤں دھیرے دھرنے لگے۔ رُک گئے۔"

"میں رُک گیا تھا؟" مجھے غصّہ آنے لگا۔

"ہاں، تم" وہ جواب دیتی ہے۔ اس کی آواز برف کی سل کی طرح گرتی ہے۔

"تمھیں اپنے متعلّق خوش فہمی ہے کیا؟"

"تمھیں ہے، مجھے نہیں۔ میں خوش فہمیوں کی دُنیا سے نکل آئی ہوں۔"

میں رُک جاتا ہوں "میں تمھارے ساتھ نہیں چلوں گا۔"

"تھینک یو" وہ جواب دیتی ہے، اور تیز چلنے لگتی ہے۔

"تھینک یو؟ کس بات پر؟" میں چلاتا ہوں۔

"میں تمھارے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتی" وہ پیچھے مڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

غصّے سے میری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا ہوں "میرے ساتھ چلنے میں کیا ہے؟ بولو!"

"تم ساتھی نہیں ہو۔"

"لیکن کیوں؟" میں اسے کندھوں سے پکڑ لیتا ہوں۔

"تم اپنی مَیں سے بھرے ہُوئے ہو۔ اتنے بھرے ہوئے ہو کہ دوسرے کی گنجائش نہیں۔ تم توجّہ دے نہیں سکتے۔ خود توجّہ طلب ہو۔"

"تم مجھے جانتی ہو کیا؟"

"جانتی نہیں" وہ جواب دیتی ہے "تمھارے ماتھے پر لکھا ہُوا ہے۔"

"تم اسے پڑھ سکتی ہو کیا؟" میں طنزاً پُوچھتا ہوں۔

"ہاں" وہ سر اُٹھا کر جواب دیتی ہے "میں عورت جو ہُوں۔"

مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے سُن کر دیا ہو۔ میں اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے اُٹھا لیتا ہوں۔ میری گردن لٹک جاتی ہے۔

مجھے دیکھ کر اس کا رویّہ بدل جاتا ہے۔ کہتی ہے "میں تمھیں دُکھانا نہیں چاہتی۔ دل میلا نہ کرو۔ سچ سُننے کی ہمّت پیدا کرو۔"

اس نے پہلی بار نگاہیں اُٹھائی ہیں۔ مجھ پر بھرپور نظر ڈالی ہے اور مُسکرا دی ہے۔ دفعتاً نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ ہو گیا ہے۔ رنگ پچکاری چل گئی ہے۔ پیڑ تن گئے ہیں۔ پتّے ہرے ہو گئے ہیں۔ بتّیاں روشن ہو گئی ہیں۔

چاندی کی چاندنی نے سارے منظر کو بھگو دیا ہے۔

میرے ارد گرد اِک بھیڑ لگ گئی ہے۔

وہ چل پڑتی ہے۔

"رُک جاؤ۔ رُک جاؤ۔" میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا ہوں۔

پیچھے پیچھے چلنے کا میرا یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ زندگی میں مَیں بارہا پیچھے پیچھے چلا ہوں۔ مجھ میں یہ صلاحیت نہیں کہ کسی کو پیچھے لگا سکوں۔ دراصل میں ازلی طور پر پیچھے چلنے والوں میں سے ہوں۔

میرا عشق پیچھے چلنا ہے۔

جو میرے پیچھے چلتی ہے، وہ دِل سے اُتر جاتی ہے۔

جب تک میں پیچھے پیچھے چلتا ہوں، جنون قائم رہتا ہے۔

جب ساتھ ساتھ چلنے کا موقع آتا ہے، قدم اُکھڑ جاتے ہیں۔

سالہا سال پہلے یہی بات مجھے اماں نے بتائی تھی۔ لیکن اماں کی بات میں نے کبھی نہ سُنی تھی۔ اماں کی بات پر میں کیسے سوچتا۔ میں تو بات بات پر اماں سے کہا کرتا تھا "اماں تم نہیں سمجھتیں۔" جو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، اُس کی بات پر سوچنا کیسا۔ اماں کی بات کو میں نے کبھی نہ جانا تھا۔ اور جانا ہی نہیں تھا تو ماننا کیسا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ بدلتے موسم کی ہوا چل رہی تھی۔ گرتے پتے کھڑ کھڑ کر رہے تھے۔ اداسی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس چھوٹے سے گھر میں ہم تین رہتے تھے۔ ننھا منیر دیوار سے لگا، بے بسی کی تصویر بنا، کھڑا تھا۔ میں ٹین کی کرسی پر بیٹھا، دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے، فضا کو گھور رہا تھا۔ بوڑھی اماں دیوار سے ٹیک لگائے آلو چھیل رہی تھی۔

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

دفعتہً اماں بولی "ایسے کیسے چلے گا بیٹے؟"

میں نے سر اُٹھایا "ایسے کیسے کیا، اماں؟"

"کب تک۔ وہ دیوار سے لگا کھڑا رہے گا؟" اُس نے منیر کی طرف اشارہ کیا "تو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے زمین کو گھورتا رہے گا، اور ہیں" وہ رُک گئی ——— "مجھ سے اب یہ کچھ نہیں ہوتا، بیٹے۔"

"کیا کریں، اماں؟"

"کوئی گھر والی لے آنا۔"

"کیسے لے آؤں؟ ملے تو لاؤں۔ ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"نہ نہ نہ" وہ بولی۔ اس کا چہرہ یوں پھوٹ گیا جیسے شیشہ تڑخ جاتا ہے۔ آواز میں منت بھری ٹوٹ جھلکی "نہ بیٹے، نہ۔ اللہ کے واسطے ڈھونڈیں نہ پڑنا۔"

"کیوں، اماں؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی پسند آ گئی تو تو اس کے پیچھے بھاگے گا۔" وہ رُک گئی۔ اُنگلی سے آنسو پونچھا "پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ سولہ سال تو اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ پھر جب وہ مل گئی تو تُو ساتھ ساتھ نہ چل سکا۔" وہ رُک گئی۔

"جو پیچھے بھاگنے والے ہوتے ہیں، بیٹا، وہ ڈرتے ہیں کہ مل نہ جائے۔ پیچھے بھاگنے کی لذت ختم نہ ہو جائے۔" وہ چُپ ہو گئی۔ میں سوچنے لگا۔ بات سامنے دھری تھی۔ پر میرے پلّے نہ پڑی۔

اب میں نے جانا ہے کہ سامنے دھری نہیں دِکھتی۔ جو ڈھونڈ کا رسیا ہو، اُسے سامنے دھری کیسے دِکھے۔

دیر تک ہم چُپ چاپ بیٹھے رہے۔

پھر اماں اُٹھی، میرے پاس آئی، ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا، تھپکا۔ بولی "بیٹے، تُو سب کچھ جانتا ہے۔ پر خود کو نہیں جانتا۔ میں تجھے جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے۔"

"تو مجھے کیسے جانتی ہے، اماں؟"

"تو اپنے ابا پر گیا ہے نا۔ ہو بہو وہی ہے۔ ہو بہو۔ اور میں نے ساری زندگی اس کے ساتھ گزاری ہے۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ پیچھے بھاگنا محبت ہے۔ بس وہ بھاگتا ہی رہا، زندگی بھر۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ دیر تک کھڑی میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ اور میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"اماں" میں نے خاموشی توڑی "محبت کیا ہوتی ہے؟"

کچھ دیر کے لیے وہ خاموش رہی، پھر بولی "بیٹے، محبت دوڑ بھاگ نہیں ہوتی۔ طوفان نہیں ہوتی، سکون ہوتی ہے۔ دریا نہیں ہوتی، جھیل ہوتی ہے۔ دوپہر نہیں ہوتی، بھور سمے ہوتی ہے۔ آگ نہیں ہوتی، اجالا ہوتی ہے۔ اب میں تجھے کیا بتاؤں کہ کیا ہوتی ہے۔ وہ بتانے کی چیز نہیں، بیتنے کی چیز ہے۔ سمجھنے کی چیز نہیں، جاننے کی چیز ہے۔"

اماں کی بات میرا راستہ روک لیتی ہے۔ میں رک جاتا ہوں۔ لیکن تڑپ بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ دیکھتا رہتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید وہ مڑ کر دیکھے۔ پھر مسکرائے۔ پھر پھلجھڑی چل جائے۔ پھر کن کہہ دیا جائے۔

لیکن وہ چلے جاتی ہے۔ یوں چلے جاتی ہے جیسے کسی نے اس کا راستہ کاٹا ہی نہ ہو۔ جیسے کسی کو پیچھے چھوڑ کر نہ جا رہی ہو ــــ سچی بات یہ ہے کہ اگرچہ میرے پاؤں رک گئے ہیں لیکن میں نہیں رکا ہوں۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہا ہوں۔ چلے جا رہا ہوں۔

دن گزر جاتے ہیں۔ ہفتے گزر جاتے ہیں۔ لیکن میں چل رہا ہوں۔ چلے جا رہا ہوں۔ اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہا ہوں۔

پتا نہیں میں اس کے پیچھے کیوں چلے جا رہا ہوں۔

کوئی خواہش نہیں، آرزو نہیں جو پیچھے چلنے پر اُکسائے۔ حصول کی خواہش نہیں، مطلب نہیں۔ مانگ نہیں۔

اسے دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

پوجا کے پھول سوکھ کر کانٹے بن چکے ہیں۔

آرتی کی تھالی خالی پڑی ہے۔

بھینٹ چڑھانے کے لیے کچھ بھی تو نہیں ہے۔

پھر بھی چلے جا رہا ہوں۔

نہ مقصد نہ منزل۔

چلتے چلتے ایک دن وہ پھر نظر آجاتی ہے۔

مجھے یقین نہیں آتا۔ آنکھیں ملتا ہوں۔

نظر تو وہ مجھے مسلسل آتی رہتی ہے۔ آتی رہتی ہے۔ وہ مسکراہٹ، وہ رنگ پچکاری جیسے کسی نے گن کر دیا ہو۔ نہیں نہیں —— فریبِ نگاہ نہیں۔ واقعی وہ پارک کے ایک کونے میں، درخت کے مقابل، زمین پر اکڑوں بیٹھی ہے۔ ہاتھ میں برش ہے۔ پہلو میں بہت سے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ روبرو ایک بڑی سی کینوس فریم پر لگی ہوئی، درخت کے سہارے کھڑی ہے۔

میں دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوتا ہوں۔

ارے! یہ کینوس پر کیا بنا ہوا ہے؟ اس قدر خوفناک چہرہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ کوئی عفریت ہے۔ یہ کیا بنا رہی ہے؟ میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں۔

دیر تک میں وہاں کھڑا رہتا ہوں۔ کھڑا رہتا ہوں۔

وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔ ایک نظر غلط انداز —— سرسری —— اور پھر سے رنگ بھرنے میں مصروف ہو جاتی ہے، جیسے پیچھے کوئی کھڑا ہی نہ ہو۔ انداز میں نہ تعجب ہے نہ

لگاؤ، بنر لاگ۔

"یہ کیا بنا رہی ہو؟" میں پوچھتا ہوں۔

"پورٹریٹ" وہ مُنھ موڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

"کس کی ہے؟"

"ہے کسی کی۔"

"کوئی عفریت ہے کیا؟

"نہیں۔ عفریت نہیں۔"

"کس کے لیے بنا رہی ہو؟"

"میری اسائینمنٹ ہے" وہ پیچھے دیکھے بغیر جواب دیے جا رہی ہے۔

"کانٹوں سے بھری شبیہہ ہے۔"

"ہاں۔ تناؤ ہے۔ تلخی ہے۔ شدّت ہے۔ مٹھاس نہیں۔ محبت نہیں۔"

"محبت تو شدّت کے بغیر ممکن نہیں" میرے مُنھ سے نکل جاتا ہے۔

"نہیں، محبت شدّت کی نفی ہے" وہ پہلی بار مڑ کر میری طرف دیکھتی ہے۔ مُسکراتی ہے۔ وہی رنگ پچکاری۔ فرحت سے بھری ایک پھُوار سی اُڑتی ہے۔ پورٹریٹ کی ساری تلخی دُھل جاتی ہے۔

"تم شدّت کو بُرا جانتی ہو کیا؟" میں پُوچھتا ہُوں۔

"شدّت خود پرستی کا ایک رُوپ ہے۔ میں اسے بُرا نہیں جانتی۔ بس مجھے گوارا نہیں۔"

"تم محبّت کو کیا سمجھتی ہو؟" میں پُوچھتا ہُوں۔

وہ میری طرف مُنھ موڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ کہتی ہے "محبّت ایک پُرسکون کیفیّت ہے۔ وجدان ہے۔ نہیں" وہ زیرِ لب گویا خود سے کہتی ہے "بتائی نہیں جا سکتی۔ صرف بیتی جا سکتی ہے۔"

دفعتہً وہ میری طرف دیکھ کر چونکتی ہے "رُک جاؤ! رُک جاؤ!" وہ اُٹھ کر میری طرف آتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے میری ٹھوڑی تھام لیتی ہے۔ پھر ٹھوڑی پر بائیں طرف اُنگلی رکھ کر پُوچھتی ہے "یہ کیا ہے؟ سکار ہے یا تل ہے؟"

"تل ہے" میں جواب دیتا ہُوں۔

وہ پورٹریٹ کی طرف مڑتی ہے، برش اُٹھاتی ہے، اور شبیہہ کی ٹھوڑی کے بائیں طرف کالا نقطہ لگا دیتی ہے۔

غُصّے سے میرا منہ سُرخ ہو جاتا ہے "کیا مطلب؟ تمہارا مطلب ہے، یہ میری ـــــــ" میں پورٹریٹ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔ لیکن میرا گلا خُشک ہو جاتا ہے۔

وہ میری طرف منّت بھری نگاہ سے دیکھتی ہے۔ کہتی ہے "سچ جاننے کا حوصلہ پیدا کرو۔"

دفعتہً پارک کے پھول انگاروں میں بدل جاتے ہیں۔ شُعلے اُٹھتے ہیں۔ پودے دھڑ دھڑ جلنے لگتے ہیں۔ منظر دھواں دھواں ہو جاتا ہے۔ میں اُٹھ کر بھاگتا ہوں۔ بھاگتا رہتا ہوں۔ پتا نہیں کب تک بھاگتا رہتا ہُوں۔

شام کو جب تھکا ہارا گھر پہنچتا ہُوں تو دفعتہً لیٹے لیٹے میرے اندر کوئی کہتا ہے: تُم خود سے بھاگ رہے ہو۔ میں چونکتا ہو جاتا ہوں۔ یہ کیا ہُوا؟ کیا میری مَیں کا ایک حصّہ باغی ہو گیا ہے؟ ضرور اس لڑکی نے مجھ پر جادُو کر دیا ہے۔ میں خود کو اس کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا ہُوں۔

نہیں۔ میں خود سے نہیں بھاگ رہا۔ یہ جُھوٹ ہے۔ غصّے میں میرے مُنھ سے نکل جاتا ہے۔ میری بیوی یہ سُن کر گھبرا گئی ہے۔ پُوچھتی ہے: یہ آپ کیا کہ رہے ہیں؟ اسے کیا جواب دُوں؟

اگلے روز صبح باتھ رُوم میں میری نگاہ آئینے پر پڑتی ہے تو میں چونک پڑتا ہُوں ـــــــ

ارے ! یہ کیا ؟ آئینے میں عفریت مجھے گھور رہا ہے۔ نہیں، نہیں۔ یہ میں نہیں۔ میں تو روز آئینہ دیکھتا ہوں۔

ہنسی کی آواز سن کر میں چونک جاتا ہوں۔

آئینے میں عفریت کے پیچھے، ہاتھ میں برش پکڑے، وہ ہنس رہی ہے۔ کہتی ہے "تم روز آئینے میں وہ دیکھتے ہو جو تم دیکھنا چاہتے ہو۔ وہ نہیں جو تم ہو۔ وہ، جو تم سمجھتے ہو کہ ہو۔"

میں آئینے پر پتھر مارتا ہوں۔ تڑاخ کی آواز آتی ہے اور پھر باہر نکل جاتا ہوں۔

شام کو جب میں گھر پہنچتا ہوں تو میری بیوی ایک بڑا سا پیکٹ میرے ہاتھوں میں تھما دیتی ہے۔ کہتی ہے "ایک خاتون دے گئی ہے۔" پیکٹ کاغذ میں لپٹا ہوا ہے۔

میں کاغذ پھاڑتا ہوں ——— ارے ! وہی پورٹریٹ ! پورٹریٹ کے کونے میں "علینی" لکھا ہوا ہے۔

تصویر کو دیکھ کر میری بیوی ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتی ہے۔ "ہمے۔ یہ تو کوئی بھُوت ہے۔"

میں اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ تصویر کو اُلٹا کر کے دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔

کچھ دیر کے بعد اچانک جو میں اُدھر دیکھتا ہوں تو سُن ہو کر رہ جاتا ہوں تصویر کینوس کی پُشت پر اُبھر آتی ہے۔

دیوانہ وار لپک کر میں تصویر کو اُٹھا لیتا ہوں اور باہر نکل جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں: میں اسے ایسی جگہ پھینک آؤں گا جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔

سڑک پر اِکا دُکا موٹریں چل رہی ہیں۔ ایک ویگن آ کر رُک گئی ہے۔ میری نگاہ اس کی پشت پر پڑتی ہے ——— ارے ! یہ کیا ؟ ——— ویگن کی نشست پر وہی تصویر بنی ہوئی ہے۔ گھبرا کر میں منھ موڑ لیتا ہوں۔ سامنے دیوار پر وہی تصویر ——— ارے ! میں بھاگ لیتا ہوں۔ جگہ جگہ ٹریفک سائنز پر وہی عفریت مجھے گھور رہا ہے۔

میں گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہوں۔

ڈرائنگ روم میں میرا دوست راجا شفیع میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں تصویر کو کمرے کی دیوار سے لگا کر راجا سے ہاتھ ملاتا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی ہے۔

ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

راجا بوڑھے ساتھی سے کہتا ہے "حاجی صاحب، میرا دوست آجکل بہت پریشان رہتا ہے۔ اس کے لیے دعا کریں۔"

"کیا پریشانی ہے؟" حاجی پوچھتا ہے۔

"میں ایک الجھن میں پھنسا ہوں" میں جواب دیتا ہوں "وہ یہ کہ میں کون ہوں؟"

حاجی مسکرا دیتا ہے۔

میں اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ کہتا ہوں "میرا مطلب ہے، کیا میں وہ ہوں جو خود کو سمجھتا ہوں، یا وہ ہوں جو لوگ مجھے سمجھتے ہیں؟"

حاجی پھر مسکراتا ہے۔ کہتا ہے "چاہے آپ یہ ہیں یا وہ ہیں، آپ اس جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہیں کہ آپ کیا ہیں؟ اپنی مَیں کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیوں اٹھائے پھرتے ہیں، خواہ مخواہ؟"

دفعتہً میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے کندھوں کا بوجھ گر گیا ہے۔ عین اس وقت شفیع چلّا کر کہتا ہے "ارے! یہ کینوس تو خالی ہے۔"

میں پورٹریٹ کی طرف دیکھتا ہوں۔ کینوس واقعی خالی ہے۔

گُرداس ۔ داس گُرو

سنگلدیپ کے مہاراج رانی شکنتلے دیوی کے پاس بیٹھے تھے ۔ دفعتہً انھوں نے سر اُٹھایا ۔ بولے "مہارانی ، کچھ دنوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے پاس ہوتے ہُوئے بھی ہمارے پاس نہیں ہوتیں ۔ یوں لگتا ہے جیسے تم بہٹ گئی ہو ۔ ایک نہیں رہیں ۔ تمھیں کس بات کی چنتا ہے ؟"

مہارانی بولی "ہاں ، مہاراج ۔ یہ سچ ہے کہ مجھے چنتا لگی ہے ۔ پر مہاراج ، بات اتنی چھوٹی ہے کہ آپ سُن کر ہنس دیں گے ۔"

مہاراج مسکرائے ، بولے "شکنتلے ، سیانے کہتے ہیں ، بڑی چنتائیں گھن گرج کرآتی ہیں ، اور چلی جاتی ہیں ۔ بے شک جھنجھوڑتی ہیں ، پر کچھ زیادہ نہیں بگاڑتیں ۔ لیکن چھوٹی چنتائیں جونک کی طرح لگ جاتی ہیں ۔ پتا بھی نہیں چلتا کہ لگی ہُوئی ہیں ۔ سوامی واسدیو کا کہنا ہے کہ چھوٹی چنتاؤں سے ڈرو ۔ انھیں بھیتر میں نہ پالو ۔ باہر نکالو ۔ انھیں جانو ۔ مانو ۔ اپناؤ ۔ اپنا لو تو دُور ہو جاتی ہیں ۔ نہ اپناؤ تو چمٹی رہتی ہیں ۔"

"آپ سچ کہتے ہیں ، مہاراج" مہارانی نے جواب دیا "پر بات میری اپنی نہیں راج کماری کی ہے ۔"

"راج کماری کی ؟" مہاراج نے دُہرایا ۔

"ہاں مہاراج" مہارانی نے جواب دیا "کچھ دنوں سے میں دیکھ رہی ہُوں کہ راج کماری کا پاؤں چلے ہے ۔ یوُں چلے ہے ، مہاراج ، جیسے انڈا پھینٹتے ہُوئے چمچہ چلتا ہے ۔"

"بے وجہ!" مہاراج نے پوچھا۔

"بے وجہ" مہارانی نے کہا "جب راج کماری بیٹھی پڑھ رہی ہوتی ہے یا آرام سے لیٹی ہوتی ہے تو اس کا دایاں پاؤں آپ ہی آپ چلتا رہتا ہے۔ اور مہاراج، اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ پاؤں چل رہا ہے۔"

یہ سُن کر مہاراج کا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ دیر تک سر جُھکائے سوچ میں پڑے رہے۔ پھر بولے "اس لیے تو نہیں کہ راج کماری جوان ہو گئی ہے؟"

"پتا نہیں، مہاراج" مہارانی نے جواب دیا "آجکل کے نوجوانوں کے ڈھنگ کچھ اور ہی ہیں۔ سُر اور ہے، تال اور ہے، رنگ اور ہے۔"

"ہُوں" مہاراج پھر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے "کہیں ایسا تو نہیں کہ راج کماری پریم کے بندھن میں بندھ گئی ہو؟"

"نہیں، مہاراج۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"وشواس سے کہ رہی ہو، شکنتلے؟"

"ہاں، مہاراج۔ پریم ایک ایسا بندھن ہے، مہاراج، جو چُھپائے نہیں چُھپتا۔ پھر یہ بھی ہے، مہاراج، کہ نئی پوچ کو بندھن سے چڑ ہے۔ کوئی بندھن ہو، کیسا بھی ہو، باہر کا ہو یا بھیتر کا، انھیں گوارہ نہیں۔"

مہاراج کے دل میں اک پھانس لگ گئی۔ سوچ میں پڑ گئے۔ کس سے پوچھیں؟ ایسے سمے انھیں سوامی واسدیو یاد آیا کرتے تھے۔ وہ مہاراج کے گُرو تھے۔ ہر بات میں سہارا دیتے۔ ہر اُلجھن میں راستہ دکھاتے۔ کڑی دھوپ میں سایہ بن جاتے۔ گھور اندھیرے میں دیے سمان ٹمٹماتے۔ لیکن آٹھ برس ہوئے وہ سنگلدیپ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ساری دنیا کے پوتر استھانوں کے درشن کریں۔ سوامی بہت بوڑھے تھے۔ چلنا مشکل تھا۔ اس لیے ان کے چیلے گُرداس نے انھیں اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر یاترا کرانے کا

عہد کیا تھا۔ آٹھ سال سے وہ لا پتا تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔

ایک روز مہاراج نے اپنے وزیر مسٹر منگل رائے سے بر بیلِ تذکرہ پوچھا" رائے جی، یہ بتائیے، کیا یہ ممکن ہے کہ جسم کا ایک حصّہ تو مسلسل حرکت میں رہے لیکن ذہن کو پتا ہی نہ ہو، خبر ہی نہ ہو؟"

رائے مہاراج کے منھ سے یہ بات سُن کر ٹھٹکے۔ بولے" مہاراج، پُوری بات کہیے۔ ادھوری سے آپ نے مجھے کنفیوزڈ کر دیا ہے۔"

مہاراج نے کہا" رائے جی، ایک لڑکی کا پاؤں چلتا ہے۔ یوں چلے جاتا ہے جیسے نیلی چڑیا کی دُم ہلتی ہے یا جیسے انجن کا پسٹن چلتا ہے۔ اور لڑکی کو خبر ہی نہیں ہوتی۔"

رائے یہ سُن کر گھبرا گیا۔ بولا" مہاراج، آپ نے یہ بات کس سے سُنی؟"

اس سوال پر مہاراج خود حیران رہ گئے۔ لیکن خاندانی راجا تھے۔ جانتے تھے کہ راجا کو سُننا زیادہ چاہیے، بولنا کم کم۔ اِس لیے چُپ رہے۔

رائے بولا" مہاراج، ایک برس ہُوا کہ میں نے کالج کی ایک لڑکی سے بیاہ کیا تھا۔ بیاہ کے دو مہینے بعد میں نے اتفاقاً دیکھا کہ میری بیوی کا پاؤں چلتا رہتا ہے۔ اَن جانے میں چلتا رہتا ہے۔ اس پر میں گھبرا گیا۔ سوچا، شاید وہ ناخوش ہے اور پاؤں کا چلنا ناخُوشی کا اظہار ہے۔ میں نے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ویدوں سے پُوچھا۔ وہ بولے: شاید یہ گھُومنے پھرنے کی دبی دبی خواہش کا اظہار ہو۔ تو مہاراج میں نے اپنی بیوی کو باہر بھجوا دیا کہ اسے خُوب گھُماؤ پھراؤ۔"

"ہُوں" مہاراج کی دلچسپی بڑھی "پھر؟"

"چھ مہینے دنیا میں گھُومنے پھرنے کے بعد جب وہ گھر لوٹی تو اس کا پاؤں پہلے سے بھی زیادہ چل رہا تھا۔

وزیر کی بپتا سُن کر مہاراج بالکل ہی کنفیوزڈ ہو گئے۔ وہ سوچتے، یہ کیسے ہو سکتا

ہے کہ جسم کا ایک حصّہ یُوں اضطراب میں، شدّت سے، چلے اور ذہن کو خبر ہی نہ ہو۔ بھگوان نے یہ کل جسے انسان کا جسم کہتے ہیں، ایسی بنائی ہے جس کا جواب نہیں۔ اِس کا ہر حصّہ دُوسرے حصّے سے جڑا ہُوا ہے۔ پھر اگر پاؤں چلے تو ضرور نسیں بھی چلتی ہوں گی۔ آنتیں بھی چلتی ہوں گی۔ اندر ایک جھگڑا چل رہا ہوگا۔ ایسے میں خبر نہ ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے!

اسی رات راج بھون میں ایک سادھو آ گئے۔ مہاراج نے راج بھون کے ساتھ ہی پھُوس کی چار ایک کُٹائیں بنا رکھی تھیں، جن میں وہ بھگتوں، سادھوؤں اور یوگیوں کو مہمان رکھا کرتے تھے۔ نوکروں کو حکم تھا کہ ان کی سیوا میں ذرا فرق نہ آئے۔

مہاراج خود ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔ حسبِ دستور اس رات وہ سادھو کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔ ہاتھ جوڑ کر جی آتیاں نوں کیا۔ سادھو نے پاس بٹھالیا۔ سادھو نے چھُوٹتے ہی کہا "راجا جی، یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ مُکھ پر چنتا نے جالا بُن رکھا ہے۔ اگر یہ چنتا پرجا کی ہے تو ٹھیک ہے۔ جو اپنی ہے تو ٹھیک نہیں۔ راجا تو سیوا کا رہوتا ہے۔ راج پاٹ تو ایک ادرش ہے۔"

"ہاں، مہاراج، چنتا ہے اور وہ اپنی ہے" مہاراج نے جواب دیا "میری پُتری جوان ہے۔ اس کا پاؤں چلتا ہے۔ چنتا کی کوئی بات نہیں۔ پھر بھی چنتا ہے۔"

سادھو ہنسنے لگا "ہاں، نئی پوچ کا یہی حال ہے۔ چنتا کی کوئی بات نہیں، پھر بھی چنتا ہے۔ جلدی کی کوئی جرورت نہیں، پھر بھی جلدی ہے۔ ہلچل کی لوڑ نہیں، پھر بھی ہلچل ہے۔"

"ایسا کیوں ہے، مہاراج؟" راجا نے پُوچھا۔

سادھو نے اپنی ٹھوڑی ٹیک پر رکھ لی اور نگاہیں دُور گاڑ دیں۔ بولا "سب سمے کا چمتکار ہے، مہاراج۔ سب سمے کی لیلا ہے۔ اک سمے آتا ہے جب لوگ عقل کے پروانے بن جاتے ہیں۔ دلیل کو مانتے ہیں۔ سُدھ بُدھ کو اُتم جانتے ہیں۔ اس سُدھ بُدھ کو جو وشواس کو نہیں

پرنتو شک شُبہے کو اُبھارتی ہے۔ وہ کیوں، کیسے، کس لیے سوچتے ہیں۔

"دو جا سمے آتا ہے جب عقل کا بُت ٹُوٹ جاتا ہے۔ دل کی دھڑکنیں اُبھر آتی ہیں۔ وشواس جاگتا ہے۔ شک شُبہے بھاگ بن کر اُڑ جاتے ہیں۔ راجا جی، اب وہ سمے نہیں جب تم پل کر جوان ہُوئے تھے۔ وہ سمے بیت گیا۔ نیا نکور سمے آیا ہے۔ پرنتو تم راجا ہو۔ تمھیں کیا خبر کہ کیسا سمے آیا ہے۔"

راجا بولا "سادھو مہاراج، میں اتنا بے خبر نہیں ہُوں۔"

"گستاخی نہ کھاؤ، مہاراج" سادھو بولا "ہر بادشاہ، ہر راجا بے خبر ہوتا ہے۔ اسے خبر اُدس پہنچتی ہے، اگر وہ چھلنی میں چھانی ہُوئی خبر ہو دے۔"

"چھلنی کیسی، سادھو مہاراج؟" راجا نے پُوچھا۔

"دیکھو، مہاراج" سادھو نے کہا "ہر راجا کے گرد جی حضوریوں کا گھیرا ہوتا ہے۔ ان کا کام راجا کو پرسن رکھنا ہوتا ہے۔ یُوں کہ جو راجا سُننا چاہے، وہی اسے سُنایا جائے۔ جو وہ دیکھنا چاہے، وہی اسے دکھایا جائے۔ جو نہ دیکھنا چاہے، نہ سُننا چاہے، وہ چھان کر پھینک دیا جائے۔ اس پر پردہ ڈال دیا جائے۔

"ویسے بھی، مہاراج، راجا کو پرجا کی خبر نہیں ہوتی۔ کارن یہ کہ پرجا پہیئے سمان ہوتی ہے۔ وہ گھومن میں پڑی رہتی ہے۔ راجا اس پہیئے کا دُھرا ہوتا ہے۔ بیچ کا نقطہ۔ وہ گھومتا نہیں۔ قیم رہتا ہے۔ اسی کارن پُرانے راجا اور بادشاہ راتوں کے سمے بھیس بدل کر گھوما پھرا کرتے تھے۔ یہ جانن کے لیے کہ پرجا کس حال میں ہے، کس رنگ میں رنگی ہے، کس چال میں چلے ہے۔"

راجا نے سادھو جی سے کہا "مہاراج، ہمارے گھرانے میں پُرانی ریت ہے کہ بچے جوان ہو جائیں تو انھیں کچھ دنوں کے لیے آشرم میں بھیج دیتے ہیں تاکہ کس بل نکل جائیں۔ آپ کہیں تو میں اپنی پُتری کو ـــــــ"

سادھو نے مہاراج کی بات کاٹی۔ بولا "نہ نہ نہ۔ آشرم میں ان کو بھیجتے ہیں جن میں پیچھے چلنے کی شکتی ہو۔ جو گرو کو جانتے ہوں۔ گرو نیتا کو مانتے ہوں۔ نئی پوچ میں پیچھے چلنے کا حوصلہ نہیں۔ وہ خود کو دوجے کے حوالے نہیں کر سکتے۔ وہ آگے چلنے کی اکسا لیے ہوئے ہیں۔ پر کوئی بات نہیں۔ جس نے یہ سمے بھیجا ہے، وہ آگے چلنے والی بھیڑوں کا رکھوالا بھی بھیجے گا۔" یہ کہہ کر سادھو خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے لیے آسمان کی طرف تکتا رہا۔ پھر کہنے لگا "نراش نہ ہو، مہاراج۔ تیرے گرو سوامی داس دیو اپنی یاترا پوری کر چکے ہیں۔ وہ پہنچنے والے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

مہاراج کو سادھو کی باتیں بہت دل لگیں۔ ان کے دل میں پرجا کے متعلق اپنی بے خبری کا احساس اُبھرا۔ ان کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ میں بھی بھیس بدل کر نگر میں گھوموں پھروں اور لوگوں کا حال چال جانوں۔ دِقت یہ تھی کہ مہاراج میں اکیلے گھومنے پھرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی ساتھی ہو۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے انھیں انجنا یاد آ گئی۔ انجنا سنگلدیپ کی اُونچی نائیکا تھی۔

مہاراج اسے ان دنوں سے جانتے تھے جب وہ خود راج کمار تھے، اور انجنا کی جوانی کی بوتل نئی نئی کُھلی تھی۔ ستوں کا عالم تھا۔ بُلبلے اُٹھتے تھے۔ پھوار اُڑتی تھی۔ چوبارے میں آنے والے تو کیا، سارے شہر والے بھیگے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں انجنا کی ناؤ سمان ڈولنے والی آنکھوں سے مہاراج مدھ کے پیالے پیا کرتے تھے۔

تعلق بھی کیا چیز ہے۔ پہاڑی چشمے کی طرح کہاں سے پھوٹتا ہے، اور پھر ندی نالہ بن کر کدھر کو بہ نکلتا ہے۔ انجنا سے مہاراج کا ناتا دل لگی اور خوش وقتی کے لیے جڑا تھا، جو چلتے چلتے جیون ساتھ بن گیا۔ اب انجنا ان کی دوست تھی، ساتھی تھی، سب کچھ تھی۔ جو بات وہ کسی اور کے مُنھ سے نہیں سن سکتے تھے، انجنا کے مُنھ سے سُنتے، سر دُھنتے۔

وہ بوڑھی ہو کر نائیکا بن گئی تھی۔ یہ، عمر رسیدہ ہو کر، مہاراج۔ دونوں جوں جوں

عمر رسیدہ ہوتے گئے تھے، تعلق توں توں بڑ کے درخت کی چھاؤں بنتا گیا تھا۔ گھنی ٹھنڈی چھاؤں۔

بائی بھی عجب مخلوق ہوتی ہے۔ اسے محبوبہ بنالو تو وہ تم سے کھیلے گی۔ تگنی کا ناچ نچائے گی۔ جلتی پہ تیل چھڑکے گی۔ سانس لینے نہ دے گی۔ ماں بنالو تو تمھاری پاکیزگی کی ضامن ہو جائے گی۔ تمھیں بچا بچا کر رکھے گی۔ اس فکر میں گھلتی رہے گی کہ داغ نہ پڑ جائے۔ دھبا نہ آجائے۔ ساتھی بنالو تو تمھارے سر پر بڑ کا درخت بن کر تن جائے گی۔ چھاؤں ہی چھاؤں۔ گھنی چھاؤں۔ خوشبودار چھاؤں۔

رات پڑی تو مہاراج نے بھیس بدلا۔ وہ جب بھی انجنا کے ہاں جاتے، بھیس بدل کر جاتے۔ بائی کے چوبارے میں صدر دروازے سے نہیں، بغلی دروازے سے داخل ہوتے۔

بائی نے جب مہاراج کی آمد کا سُنا تو اُس نے ننھی، گڈی اور گلابی کو ہدایات دیں کہ محفل جاری رہے، رقص کی لے بڑھتی جائے اور نرت میں آنکھیں یوں کنکھیوں سے نکل نکل کر باتیں کریں کہ تماش بینوں کے لیے سانس لینا دشوار ہو جائے۔ اور خود پچھلے دالان میں مہاراج کے پاس آبیٹھی۔

مہاراج پہلے بائی سے اِدھر اُدھر کی پُوچھتے رہے۔ اصلی بات کھولنے سے پہلے رسمی فیتے کناریاں ٹانکتے رہے۔ بائی کائیاں تھی اتنے سارے دلوں سے کھیل چکی تھی۔ جانتی تھی کہ باہر کی بات کیا ہوتی ہے، بھیتر کی کیا ہوتی ہے۔ بولی "اے حضور، اب اصلی بات پہ آئیے۔ کیسی چنتا لگی ہے؟"

مہاراج ہنس کر بولے "چنتا ہی کو دُور کرنے کے لیے تمھارے دوار آئے ہیں۔"

بائی مُسکائی "اے حضور، ہم بائیاں چنتائیں دُور نہیں کرتیں۔ انھیں پیدا کرتی ہیں۔ اُبھارتی ہیں۔ یُوں کہ ان کا تار بندھا رہے۔"

مہاراج نے کہا "انجنا، یہ چنتا ہماری نہیں، ہماری پُتری کی ہے۔"

وہ سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئی "کیا ہوا، راجکماری کو ؟"

"اس کا پاؤں چلتا ہے" مہاراج نے کہا۔

"پاؤں چلتا ہے ! یہ تو چنتا کی بات نہیں۔ گھر گھر یہی حال ہے۔ جوان لڑکیوں کے پاؤں یوں چلتے ہیں جیسے گھڑی کا پنڈولم چلتا ہے۔"

"انجنا۔ اَن جانے میں چلتا ہے" مہاراج نے کہا۔

"جانے میں تو اتنی تیزی سے چل ہی نہیں سکتا، حضور۔"

"سیانے کہتے ہیں، گھٹن کی وجہ سے چلتا ہے۔"

"نہیں، حضور، ایسا نہیں۔ اب میرا ہی گھر لیجیے۔ یہاں کیا گھٹن ہوگی۔ پر میری سب سے چھوٹی نوجی جو ہے، اس کا پاؤں چلتا ہے۔ میں نے پکڑا پکڑا کر اس کا پلیٹھن نکال دیا۔ پھر بھی چلتا ہے۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا : باجی، میں داس آشرم ہو آؤں ؟"

"داس آشرم ؟" مہاراج نے دُہرایا "یہ کیسا آشرم ہے ؟"

"وہ نوجوانوں کا آشرم ہے۔ وہاں جو تپسوی بیٹھا ہے، وہ بھی نوجوان ہے۔ وہ خود کو گُرو نہیں، بلکہ داس کہتا ہے۔ وہاں وہ نوجوان جاتے ہیں جن کے پاؤں چلتے ہیں۔ نہیں چلتی ہیں۔ دل چلتے ہیں۔ وہاں کوئی روک ٹوک نہیں۔ نوجوان جو جی چاہے، کرتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ گاتے ہیں۔ دارو پیتے ہیں۔ تاش کھیلتے ہیں۔ جب گرو ہی کوئی نہیں تو حضور، بندش کیسی۔ نوجوان وہاں رہنا چاہیں تو ٹیلے پر کھلے میدان میں پھوس کا جھونپڑا بنا لیتے ہیں۔ بس داس کا ایک مطالبہ ہے کہ رات کے وقت لڑکیاں لڑکوں میں نہ رہیں۔ الگ جھونپڑے میں چلی جائیں۔"

مہاراج بولے "انجنا، چلو، ہم بھی وہاں چلیں۔"

"حضور، میرا خود جی چاہتا ہے کہ جا کر دیکھوں۔"

"پھر سوچتی کیا ہو ؟"

"وہ ہمیں وہاں ٹکنے نہیں دیں گے۔ عمر رسیدہ لوگوں کے لیے داس آشرم کے دوار بند ہیں۔"

"نہ ٹکنے دیں" مہاراج نے کہا "چلو، ایک نظر ہی دیکھ لیں گے۔ ایک سادھو مہاراج راج بھون آئے تھے۔ کہتے تھے: راجا کو پرجا کے حال کا پتا نہیں ہوتا۔ جو خبر ملتی ہے وہ چھلنی میں چھانی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لیے راجا پر لازم ہے کہ بھیس بدل کر باہر نکلے۔ پرجا کے رنگ ڈھنگ، دکھ درد اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ انجنا، تم میری ساتھی بنوگی؟"

انجنا ہنسی۔ بولی "اے حضور، بائی صرف دو کام جانتی ہے۔ ایک تو لوگوں کو لوٹنا۔ انھیں بے وقوف بنانا۔ موندنا۔ نچوڑنا۔ اور دوجے ساتھ دینا۔ تن من دھن سے ساتھ دینا۔ حضور، یہاں بس لوٹنے کا ہی کام ہے۔ میں تو ترسی ہوئی ہوں کہ کوئی ہو جس کا ساتھ دے سکوں۔"

انجنا اور مہاراج دونوں نے گیروے کپڑے پہنے، سادھو سادھنی کا رنگ جمایا اور داس آشرم کو چل پڑے۔ داس آشرم مایا نگر کے پاس ڈنگے ٹبے کی چوٹی پر واقع تھا۔ جب وہ ڈنگے ٹبے کے اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بہت کھلا میدان ہے، جس میں یہاں وہاں بہت سے گھنی چھاؤں کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ درختوں کی چھاؤں میں بیس پچیس پھوس کے جھونپڑے بنے ہوئے ہیں۔ جھونپڑوں کے سامنے، میدان میں، نوجوان ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک ٹولی گانے میں مصروف ہے، دوسری ناچ رہی ہے۔ ایک ٹولی سردائی گھوٹنے میں مصروف ہے۔

سادھو سادھنی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سب متوجہ ہو گئے۔ گانا بجانا چھوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ دیکھ کر داس کا بالکا دوڑا دوڑا ان کے پاس آیا۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ بولا "سادھو، سادھنی جی، جی آیاں نوں۔ پرنتو کوئی بھول ہے۔ یہ استھان سادھوؤں کے لیے نہیں۔"

سادھنی بولی "مہاراج، ہم بھول سے اِدھر نہیں آئے۔ ہمیں آشرم کے گرو سے

ملنا ہے۔"

"نہ، مہاراج" بالکے نے جواب دیا "یہاں کوئی گرو نہیں۔ یہ آشرم نہیں، چھوٹوں کی منڈلی ہے۔ چھوٹوں کے داس اُدھر اُس کٹیا میں بیٹھے ہیں۔"

"بس ہمیں انھیں سے ملنا ہے۔ گھبراؤ نہیں، ہم یہاں ٹکیں گے نہیں۔ داس سے ملنے کی آگیا دو۔"

"نہ، سادھنی جی۔ یہاں کوئی آگیا نہیں دی جاتی۔ یہاں کوئی روک نہیں، ٹوک نہیں۔ جب گرو ہی نہیں تو روک ٹوک کیسی۔ یہاں کوئی دوار بند نہیں۔ سب کھلے ہیں۔ وہ سامنے رہا، داس جی کا دوار۔ پدھاریے، سادھو، سادھنی جی۔"

داس ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ بال لٹ پٹ۔ ڈاڑھی گھنی، بھورکالی۔ گیروے رنگ کی جین اور قمیص۔ آنکھیں مدھ سے مخمور۔ سادھو سادھنی کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ انھیں چٹائی پر بٹھایا۔

سادھنی بولی "یہ کیسا آشرم ہے، مہاراج؟"

داس نے جواب دیا "یہ آشرم نہیں، سادھنی جی، منڈلی ہے۔"

"آشرم نہیں منڈلی ہے۔ گرو نہیں داس ہے۔ یہ کیسا بھید ہے، مہاراج؟"

داس بولا "بس یہی ایک بھید ہے کہ کوئی بھید نہیں۔ اس سنسار کی طرح سادھنی جی، بھید سامنے دھرا ہے۔ لوگ سامنے دھرے کو نہیں دیکھتے۔ کہتے ہیں، بھید ضرور چھپا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ڈھونڈیں لگے ہیں۔ پربھو نے سامنے دھر کر بھید کو چھپا لیا ہے۔"

"سچ کہتے ہو، داس جی" سادھو گنگنایا۔

سادھنی بولی "بات کھلی نہیں، داس جی مہاراج۔ آپ نے یہ روپ کیوں بدل دیے؟ آشرم کو منڈلی بنا دیا۔ گرو کو داس بنا دیا۔ مہاراج، مدھ تو ایک ہی ہے۔ یہ پیالہ کیوں بدل دیا؟"

"سچ ہے،" سادھنی، مدھ تو ایک ہی ہے۔ پر ٹھوٹھے بدلتے رہتے ہیں۔ جیسا سمے ویسا ٹھوٹھا۔ پرانے سمے میں لوگ کہتے تھے: کوئی آگے چلے۔ راستہ دکھائے۔ گرو بنے۔ اب سمے بدل گیا ہے۔ پیچھے چلنے والے لوگ نہیں رہے۔ اب ایسا گرو چاہیے جو پیچھے چلے۔"

"داس جی" سادھو بولا "ایسا کیوں ہے کہ آج کے لوگ پیچھے چلنے والے نہیں؟"

داس مسکرایا۔ بولا "سادھو جی مہاراج، آگے پیچھے کو بھول جاؤ۔ آگے پیچھے کا دشواس ہم نے خود باندھ رکھا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہاں نہ کوئی آگے ہے، نہ پیچھے ہے۔ یہ دیکھو کہ وہ چلنے والے ہیں۔ ان میں چلنے کی لگن ہے۔ ان میں ڈھونڈ ہے۔" وہ رک گیا۔ پھر بولا "مہاراج، جب پرانی راہیں پٹ جاتی ہیں تو پر بھو ڈھونڈ کی جوت جگاتے ہیں۔ اور مہاراج، ڈھونڈ اندھی ہوتی ہے۔ آگا پیچھا نہیں دیکھتی۔ برا بھلا نہیں دیکھتی۔ انھوں نے کیا نہیں آزمایا۔ دیس تیاگا۔ دولت تیاگی۔ آرام تیاگا۔ ڈگر ڈگر گھومے۔ نشہ اپنایا۔ اب وہ حرکت کی بھینٹ چڑھے ہوئے ہیں۔ جلدی کے چکر میں پڑے ہیں۔ ان کی راہ رو کو۔ جنھیں نئی راہ ڈھونڈنا ہوتی ہے انھیں روک سکتے نہیں۔ روکو گے تو ان کے دل چلیں گے، نسیں چلیں گی، پاؤں چلیں گے، وچار چلیں گے۔" داس خاموش ہو گیا۔ کٹیا میں گہری خاموشی چھا گئی۔

"ایک بات پوچھوں، داس مہاراج؟" سادھنی نے خاموشی کو توڑا۔ داس نے سر اٹھایا۔

سادھنی بولی "آپ کا گرو کون ہے؟"

"میرے پتا جی" داس نے کہا۔

"وہ کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں" داس بولا "جب میں سترہ سال کا تھا، وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انھوں نے پرتگیا کی تھی کہ اپنے گرو سوامی واسدیو کو اپنی پیٹھ پر لاد کر دنیا بھر کے پوتر استھانوں

کی یاترا کرائیں گے۔"

"تم ــــ تم ــــ!" سادھو حیرت سے بولا "تم گُرداس کے پُتر ہو؟"

"جی، مہاراج" داس نے جواب دیا "میرے پتا بہت بڑے داس تھے۔ اُنھوں نے مجھے داس بننا سکھایا۔ وہ گرو کے داس تھے۔ میں چیلوں کا داس بنوں گا۔ راہ تو ایک ہی ہے۔ چاہے آگے چل کر راہ دکھاؤ۔ چاہے پیچھے چل کر راہ پر لاؤ۔"

"دھن ہو، مہاراج" سادھو ہاتھ جوڑے فرطِ جذبات سے اُٹھ بیٹھا۔

عین اس وقت باہر میدان سے اِک شور بلند ہُوا۔ کُٹیا میں خاموشی چھا گئی۔ سب کی توجہ شور پر لگی تھی۔ پھر بالک دوار پر آکر چلّایا "مہاراج، آپ کے پتاجی پدھارے ہیں۔"

"میرے پتاجی!" داس نے دُہرایا اور وہ کُٹیا سے باہر نکل گیا۔ پیچھے پیچھے سادھو اور سادھنی تھے۔

سامنے بڑ کے درخت تلے ایک شخص بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنے بُڈّھے گرو کو پیٹھ پر اُٹھایا ہُوا تھا۔ درخت کے قریب پہنچ کر سادھو نے ہاتھ جوڑے "سوامی داس دیو جی مہاراج۔"

سادھنی نے چیخ ماری۔ "وہ دیکھو! وہ دیکھو!" وہ چلّائی۔ "گرو کا دھڑ سُوکھ کر چیلے کے گرد لٹکا ہُوا ہے اور چیلے کا سر سُوکھ کر گُرو کی چھاتی پر ڈھلکا ہُوا ہے۔"

"بھگوان کی لیلا ہے" داس بولا "جس چیز کی لوڑ نہ تھی وہ سُوکھ کر جھڑ گئی۔ داس کا سر، گُرو کا دھڑ، دو جسم ایک بن گئے۔"

بالکا چلّایا "مہاراج، آج گرو اور چیلے کا بھید کھُل گیا۔"

"ابھی نہیں" سادھنی بولی "اس بھید نے نیا چولا بدل لیا ہے۔ گُرو چیلوں کا داس بن گیا ہے۔"

دو مُونہی

سوچتی ہُوں کہ میں تیاگ کلینک میں گئی ہی کیوں ؟ کیا فائدہ ہُوا بھلا؟ اپنی بیماری دُور کرانے کے لیے گئی تھی۔ ساری مخلوق کو بیمار کر کے آ گئی۔ وہی بات ہوئی نا: بُڑھیا، بُڑھیا، تیرا کُبڑ دُور ہو جائے یا ساری دُنیا کُبڑی ہو جائے۔

لیکن تیاگ بیتی سُنانے سے پہلے میں اپنا تعارُف تو کرا لوں۔ میں سانولی ہُوں۔ تیس سال کی۔ سلمان سے میرج ہُوئے دو سال ہُوئے ہیں۔ لَو میرج تھی۔ میرے خد و خال عام سے ہیں۔ یعنی ایوریج سے کچھ بہتر۔ ہاں، ذہن کی تیکھی ہُوں۔ کاٹھی مضبوط ہے۔ جسم تنا تنا ـــــــ لیکن نہیں۔ میں غلط بیانی کر رہی ہُوں۔ کسرِ نفسی سے کام لے رہی ہُوں۔ میرے خد و خال ایوریج سہی، لیکن مُجھ میں بڑا چارم ہے۔ راہ چلتے سر اُٹھا اُٹھا کر، گردن موڑ موڑ کر، دیکھتے ہیں۔ دیکھتے ہیں تو یُوں دِکھتے ہیں جیسے سر سے پاؤں تک اُلّو کے پٹھے بن گئے ہوں۔ بس میں نہیں رہتے۔ کنٹرولز ہاتھ سے چھُوٹ جاتے ہیں۔ ڈول لیتے ہیں۔ پتوار چھُوٹ جائے تو کشتی ڈَولتی ہے نا۔

میں لڑکی پن سے نِکل آئی ہُوں۔ لیکن ابھی لڑکی ہی ہُوں۔ عورت نہیں بنی۔ اللہ نہ کرے کہ بنوں۔

عجیب سا عالم ہے۔ جیسے شام کو ڈسک ہوتی ہے۔ رات نہیں پڑی۔ دن بھی نہیں رہا۔ لیکن دِن دِن سا لگتا ہے۔

لو، ایک بات تو میں بھول ہی گئی۔ مجھ میں ایک عجیب سی بات ہے۔ جیتی ہُوں۔

بھرپور جیتی ہُوں۔ بھری ڈائمنشنل زندگی سے عشق ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خود کو جیتے ہُوئے دیکھتی بھی ہُوں۔ پرکھتی رہتی ہوں۔ سیانے کہتے ہیں، یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہوتیں۔ نہیں ہوسکتیں۔ یا تو جیو، یا خود کو جیتے دیکھو۔ وہی ایٹ دی کیک اینڈ ہیو اِٹ والی بات ہے۔ پتا نہیں میری بات کیوں الگ ہے۔ کیک کھاتی بھی ہُوں، پاس بھی رکھے رہتی ہے۔

ہٹئے! مصیبت ہے۔ بڑی مصیبت ہے۔ اپنے برتاؤ کی تفصیلات پر نظر رکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مثلاً میں جُھوٹ بولتی ہُوں۔ ساری دُنیا بولتی ہے۔ میں کس شمار قطار میں ہُوں بھلا۔ لوگوں کے لیے جُھوٹ ایک معصوم سی، چٹکیلی سی، آرام دہ بات ہے —— ہٹئے! ایسا ہے۔ مجھے تو پتا نہ تھا۔ —— لو، میں نے خط لکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں نہیں ملا —— نہیں، نہیں۔ مجھے تو اس لڑکے سے جذباتی لگاؤ نہیں —— ایسے ایسے آرام دہ جُھوٹ! لیکن ایسے جُھوٹ میرے لیے آرام دہ نہیں ہوتے، کانفلکٹ کا باعث بن جاتے ہیں۔ اِدھر جُھوٹ بولا، اُدھر اندر سے آوازے اُٹھے: جُھوٹ، جُھوٹ، جُھوٹ۔

نہیں، یہ مثال غلط ہے۔ مجھے یہ مثال نہیں دینی چاہیے تھی۔ میں نے تو کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔ کیوں بولوں؟ جھوٹ وہ بولتے ہیں جنھیں ڈر ہوتا ہے کہ سُننے والے کو سچ کڑوا لگے گا، اور وہ تھُو تھُو کرے گا۔ میں تو ان لڑکیوں میں سے ہُوں جن کے مُنھ میں سے کڑوا سچ سُن کر بھی سُننے والا بدمزہ نہیں ہوتا۔ پھر جُھوٹ بولنے کا فائدہ؟ ہاں تو میں کہ رہی تھی مجھ میں بڑا چارم ہے۔ راہ چلتے کوئی بانکا اچّھا لگے تو ایسی چھلکی چھلکی بھرپور نگاہ ڈالتی ہوں کہ اس کا سارا کلف اُتر جاتا ہے۔ "گویا" ہو کر گر پڑتا ہے۔ پھر میرے اندر سے آواز آتی ہے: تت تت۔ بیچارہ۔ اپنے آپ سے بھی گیا۔

مجھے پتا ہے کہ میں بڑی طاقت ور نگاہ رکھتی ہُوں۔ اتنی سادگی سے نخرہ کرتی ہُوں کہ کوئی اسے نخرہ مان ہی نہیں سکتا۔ سمجھتا ہے انوسنس ہی انوسنس ہوں۔ میک اَپ کرتی ہوں لیکن کیا مجال کوئی سمجھے کہ میڈ اَپ ہے۔ سمجھتے ہیں میک اَپ سے بے نیاز ہُوں۔ لو، وہ

میک اَپ ہی کیا ہُوا جو میک اَپ نظر آئے۔ پھٹے مُنھ ایسے میک اَپ کا۔

بس میری ایک ہی مشکل ہے۔ میرے اندر کچھ ہے۔ پتا نہیں کیا ہے۔ پر ہے۔ جس طرح مدفون خزانے پر سانپ ہوتا ہے، جس طرح اہرامِ مصر کے اندر جادُو ٹونا کیلا ہُوا ہے۔ ویسا ہی کچھ ہے۔

اُونہوں! غلط کہ گئی۔ میرے اندر ایک نہیں، دو ہیں۔ وہ دو روحیں ہیں۔ کبھی ایک کنٹرول پر بیٹھ جاتی ہے، کبھی دُوسری۔ میں دو مُونہی سانپ کی طرح ہوں۔ کبھی دومونہی دیکھی ہے؟ اس کے دو سر ہوتے ہیں۔ ایک سر کی جانب، دوسرا دُم کی جانب۔ سر اُٹھایا، چل پڑی۔ پھر رُک گئی۔ سر زمین پر رکھ دیا۔ پھر دُم والا سر اُٹھایا اور اس جانب چلنے لگی۔ کبھی اِس جانب کبھی اُس جانب۔ پتا نہیں چلتا کہ کب کس جانب چلنے لگوں گی۔ پیش خبری سے عاری ہُوں۔ مطلب کہ UNPREDICTABLE ہوں۔ بس یہی میری مشکل ہے۔ یہی میری بیماری ہے۔

لیکن ٹھہریے۔ شُروع شروع میں مجھے پتا نہ تھا کہ UNPREDICTABILITY بُری چیز ہے۔ اُلٹا میں تو سمجھتی تھی کہ یہ بڑی پیاری خصوصیت ہے۔ آپ کو کیا پتا۔ جوان لڑکی ہو۔ چھیڑ دینے والی نگاہ ہو۔ بے نیازی سے مخمور ہو۔ اُوپر سے برتاؤ UNPREDICTABLE ہو۔ پھر تو وہ تلوار بن جاتی ہے۔

بچپن سے ہی میں دو دلی تھی۔ کبھی تو اپنی ممی اتنی اچھی لگتی، اتنی اچھی لگتی کہ میں اس کے وارے نیارے جاتی۔ کبھی آنکھ اُٹھا کر دیکھتی تو ایسے دِکھتی جیسے اُکتائی، تھکی ہاری، بے جان عورت ہو۔ کبھی ماں باپ بڑے پیارے لگتے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے قصائی ہوں۔

دو ایک محبّتیں بھی ہُوئیں۔ کبھی محبت کے جذبات سے چھلکتی، چھلکے جاتی۔ کبھی سُوکھی کاٹھ ہو کر رہ جاتی۔

یہ دو دھاری پن بچپن ہی سے موجود تھا۔ وہ "سوادی" تھی۔ کھٹ مِٹھی۔ گنگا جمنی۔

گرم ٹھنڈی۔ اُلٹی سیدھی۔ سبھی کچھ تھی۔ لیکن ان دنوں میں اس بات کو اہمیت نہ دیتی تھی۔ جوان ہُوئی تو وہ موہنی اُبھرتی آئی، اُبھرتی آئی ــــــ چھاگئی۔ پھر دفعتہً مجھے احساس ہُوا۔ ڈر گئی۔ بُری طرح سے ڈر گئی۔

ان دنوں میں سلمان کی محبت میں چُور تھی۔ اتنی لت پت تھی کہ دُوسرا سر اُٹھانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس دیوانگی میں ڈیڑھ سال گزر گیا۔ پھر ایک روز میں نے جو سر اُٹھاکر دیکھا تو سامنے سلمان نہ تھا۔ پتا نہیں کون تھا۔ نہ وہ رنگ نہ رُوپ، نہ تازگی نہ چمک۔ عمومیت اور بے بسی سے لدا پھندا ایک انسان، پژمُردہ، بے جان، جس سے مشک کافور کی بُو آتی تھی۔ میں ڈر گئی۔ اپنی دُنیا، اپنی زندگی تباہ ہونے کے خوف سے ڈر گئی۔ خود کو بچانے کے لیے میں نے جھٹ پٹ سلمان سے شادی کر لی۔ شادی کی ہماہمی میں بات پھر چل نکلی۔

بہرحال، مجھے احساس ہو گیا کہ یہ ایک بیماری ہے۔ میں منقسم ہُوں۔ میں نے اس احساس کو بہُت دبایا۔ جتنا دباتی اُتنا اُبھرتا۔ میں نے بڑے جتن کیے۔ ڈاکٹروں سے ملی۔ ہسپتالوں میں اس قدر گھومی پھری کہ لوگ مجھے ہاسپٹل واکر سمجھنے لگے۔ سپیشلسٹ دوا کیا دیتے، اُنھوں نے میری بیماری کو سمجھا ہی نہیں۔ میں نے بہُت سمجھایا لیکن سمجھانا آسان ہوتا ہے سمجھنا بہُت مشکل۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو گئی۔

شادی سے پہلے تو سلمان میری UNPREDICTABILITY پر اس قدر مسحور ہوتا تھا جیسے سانپ بین پر ہوتا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ شادی کے بعد بھی یونہی پھن پھیلا کر میرے ہیرے پھیرے لیتا رہے گا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کا پیش خبری کا مطالبہ بڑھتا گیا۔ اسے میرے وہ موہنی پن پر غصہ آنے لگا۔ میں گھبرا گئی۔ سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ اِدھر میں بھی تو ایک نہ تھی۔ میرے اندر کی دُوسری میرے کان میں سرگوشی کرنے لگی "ہٹاؤ سلمان کو۔ کوئی اور سہی جو تیرے وہ موہنی پن پہ مسحور ہو جائے۔ اپنے گرد کوئی اور پھن پھیلا دیکھو۔ دُنیا میں نوجوان سبھی اد لتی بدلتیوں پہ جان چھڑکتے ہیں۔ یہ سر زمین پر رکھ دو۔ دوسرا اُٹھاؤ۔"

دُوسرا سر اُٹھا کر سلمان کی طرف دیکھتی تو وہ سپاٹ نظر آتا۔ روکھا پھیکا۔ ہیے! کیا میں اس پر جان دیتی رہی ؟

پھر وہ واقعہ پیش آگیا اور میں لرز کر رہ گئی۔

ایک روز سلمان کا ایک نیا دوست گھر آگیا۔ اس وقت سلمان موجود نہ تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہی ——— وہی دو سال پہلے کا سلمان جسے دیکھ کر میں نے خود کو اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ وہی رنگ۔ وہی رُوپ۔ وہی شوخی۔ وہی تازگی۔ میں نے اَن جانے میں ایک بھرپور چھیڑ دینے والی نگاہ ڈال دی۔ اس نے پھن پھیلایا، اور بین کے ہیرے پھیرے لینے لگا۔ عین اس وقت سلمان آگیا۔ میں جاگ پڑی۔ ہوش میں آئی تو دیکھا کہ میری "میں" الٹ پلٹ ہو رہی ہے۔ ڈر گئی۔ بُری طرح سے ڈر گئی۔ اس روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ تیاگ کلینک جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ چاہے کچھ ہو جائے۔

چھ مہینے پہلے تیاگ کلینک کے متعلق میری ایک سہیلی نے مجھے بتایا تھا۔ وہ خود ذہنی بیماری میں مبتلا تھی۔ ایک مہینا تیاگ کلینک میں زیرِ علاج رہی۔ صحت مند ہو کر لوٹی۔

دُور پہاڑوں میں تیاگ ایک قصبہ ہے۔ وہاں ڈاکٹر داؤد نے ذہنی بیماروں کے لیے ایک ہسپتال کھول رکھا ہے۔ ڈاکٹر داؤد ایک زمیندار ہے۔ ولایت سے ایم ڈی کر کے آیا ہے۔ مقصد پریکٹس کرنا نہیں، بلکہ علاقے کے لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ عمر بھر کے تجربے اور تحقیق کے بعد اس نے ایک اپنا طریقِ علاج ڈسکور کیا ہے۔ جڑی بوٹیوں اور رسم رُوم سے علاج کرتا ہے۔ اس کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی ہے۔ دُور دُور سے مریض آتے ہیں۔ ان کی رہائش کے لیے ڈاکٹر نے ایک ہوسٹل تعمیر کر رکھا ہے۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی، لیکن میری سہیلی نے بتایا کہ علاج شروع کرنے سے پہلے وہ مریضوں سے زبانی اور تحریری حلف لیتا ہے کہ علاج کے دوران میں بغیر چون و چرا ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کروں گا۔ اس دوران میں ذاتی سوچ بچار کو عمل میں نہیں لاؤں گا۔ میں

سچے دِل سے اپنی دِل سرنڈر کرتا ہُوں۔ یہ سُن کر ڈر گئی۔ نہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں سبھی کچھ تیاگ سکتی ہُوں، اپنی دِل نہیں تیاگ سکتی۔ میرے پاس لے دے کر اِک "میں" ہی تو ہے۔ اسے میں کیسے تیاگ دوں؟ کیسے کسی دُوسرے شخص کے تابع کر دُوں؟ نہیں، نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ میری سہیلی نے مجھے بہُت سمجھایا کہ ذہنی بیماری کے علاج میں سب سے بڑی رُکاوٹ "میں" ہی تو ہوتی ہے۔ اس نے بڑی دلیلیں دیں، لیکن میں نہ مانی۔

اس سے کچھ دیر پہلے میرے چچا نے مجھے ایک بزرگ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اُنھوں نے کہا "سانوری، بیٹی۔ تیری ساری مُشکلات دُور ہو جائیں گی۔"

بُزرگ کی خدمت میں پہنچی۔ انھیں تفصیل سے اپنی ذہنی کیفیت سُنائی۔ سُن کر بولے "بیٹی، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہماری بیعت کر لو۔"

"بیعت کیا ہوتی ہے؟" میں نے پُوچھا۔

بولے "بیعت کا مطلب ہے، حوالگی، سپردگی۔ خود کو ہمارے سپُرد کر دو۔"

"کیسے سپرد کر دُوں؟" میں نے پُوچھا۔

بولے "اپنی میں تیاگ دو۔ سارا شر تمھاری میں کا ہے۔ وہ خود سر ہوگئی ہے۔ بٹ کر دو ہوگئی ہے۔ جیسے سانپ کی زبان بٹ کر دو ہو جاتی ہے۔"

غصّے میں مَیں کھولنے لگی، اور جواب دیے بغیر بھاگ آئی۔

ہاں تو، اس روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ تیاگ کلینک جاؤں گی، لیکن حلف نہیں اُٹھاؤں گی۔

اسی رات میں نے سلمان سے کہا "سلمان، میں ایک مہینے کے لیے ہل سٹیشن پر جانا چاہتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر کے لیے اکیلی رہوں، کسی ایسے پہاڑی مقام پر جہاں بھیڑ بھڑکّا نہ ہو۔ کراؤڈ نہ ہو۔"

اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ دیر تک چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر بولا

"دیکھو! اگر واقعی تم تنِ تنہا رہنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

تیاگ کا سفر خاصا دشوار تھا۔ پہلے تو گلیات کی طرف جانا پڑا۔ رات وہاں ٹھہری۔ پھر پھول گلی سے تیاگ جانے والی سوزوکی مل گئی۔ سڑک بہت تنگ اور نیم پختہ تھی۔ ساٹھ میل کا سفر سات گھنٹوں میں طے ہوا۔ شکر ہے، کلینک سے ملحقہ ہوسٹل میں جگہ مل گئی۔ رات گویا گھوڑے بیچ کر سوئی۔ اگلے دن، نو بجے کے قریب، کلینک پہنچی۔ ایک گھنٹا ریسپشن میں انتظار کرنا پڑا۔ پھر ڈاکٹر نے اندر بلا لیا۔

اپنے رُوبرو ایک نوجوان ڈاکٹر کو دیکھ کر میں حیران ہوئی۔ سہیلی کی باتیں سُن کر میں سمجھی تھی کہ ڈاکٹر داؤد "معمر" آدمی ہوگا۔

"آپ ڈاکٹر داؤد ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں ان کا بیٹا ڈاکٹر خالد ہوں" وہ بولا "والد صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ اب میں ان کی جگہ کام کر رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے خالد نے ایک لمبا سا کاغذ اُٹھا لیا۔ بولا "سب سے پہلے آپ اپنی کیس ہسٹری لکھوا دیجیے۔ ہر وہ تفصیل بتائیے جسے آپ اہم سمجھتی ہیں۔"

دو گھنٹے میں کیس ہسٹری مکمل ہوئی۔ میں نے ہر بات بتا دی۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا "اب آپ آرام کیجیے۔ رات کو میں آپ کا کیس سٹڈی کروں گا۔ کل سے آپ کا علاج شروع ہو جائے گا۔"

پتا نہیں اس وقت میرے ذہن میں یہ بات کیسے آئی۔ میں نے کہا "میں آپ سے ایک سوال پُوچھنا چاہتی ہوں۔ یہ بتائیے مجھے کہ اس گاؤں کا نام تیاگ کیوں ہے؟"

وہ مُسکرایا۔ کہنے لگا "بس نام ہے۔ جس طرح آپ کا نام سانوری ہے۔ حالانکہ آپ گوری ہیں۔" تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے پھر سے بات شروع کی۔ کہنے لگا "والد صاحب کا اس کے متعلق ایک نظریہ تھا۔ مفروضہ کہہ لیجیے۔"

میں پھر سے بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر خالد میں مجھے ایک بے نام سی کشش محسوس ہونے لگی تھی۔

"بتائیے نا" میں نے کہا "وہ مفروضہ کیا تھا؛ لیکن پہلے تو یہ بتائیے کہ تیاگ کا مطلب کیا ہے؟"

کہنے لگا "تیاگ ہندی کا لفظ ہے۔ مطلب ہے: چھوڑ دینا، ترک کر دینا۔ یہ قصبہ ہندوؤں نے آباد کیا۔ اُوپر ٹیلے پر ایک مندر بنا ہوا ہے۔ مندر کے ساتھ ایک عمارت ہے۔ غالباً اس عمارت کا نام تیاگ بھون تھا۔" وہ رُک گیا۔

"والد صاحب کا نظریہ بھی تو بتائیے نا؟" میں نے پوچھا۔

مُسکرا کر بولا "والد صاحب کا کہنا تھا کہ پہاڑوں کی بلندی کا انسانی جذبات سے گہرا تعلق ہے۔ جُوں جُوں نیچے اُترو، جذبات کی شدّت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ گاڑھے ہو جاتے ہیں۔ بوجھل، بھاری۔ جُوں جُوں اُوپر جاؤ، جذبات میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ مٹھاس پیدا ہوتی ہے۔ نیچے لاگ لگاؤ بڑھتے ہیں۔ اُوپر بے نیازی کا سماں پیدا ہوتا ہے۔ والد صاحب کہا کرتے تھے: دس ہزار کی بلندی پر بھور سمے کا عالم ہوتا ہے۔"

"بھور سمے کیا؟"

"جس طرح صُبح سویرے ڈان کے وقت سپیدی سی ہوتی ہے۔ ایک عجب سا سکون، اطمینان، نروان۔ دس ہزار کی بلندی پر جذبات کی ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔ نیچے کے لوگ زندگی کے تالاب میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُوپر کے لوگ ڈوبتے نہیں، تیرتے ہیں۔ نیچے خواہش میں ڈنک ہوتا ہے۔ اُوپر خواہش تو ہوتی ہے، پر اس میں ڈنک نہیں ہوتا۔ نیچے انسان کی "میں" میں اتنا ملبہ ہوتا ہے کہ وہ پتھر بن جاتی ہے۔ اُوپر رُوئی کے گالے جیسی ہلکی پُھلکی رہتی ہے۔ نیچے محبت اور نفرت دونوں میں دھار ہوتی ہے۔ اُوپر نفرت بھی ہوتی ہے، محبت بھی، لیکن دھار نہیں ہوتی۔"

"اُوپر سے آپ کی کیا مراد ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"آٹھ دس ہزار کی بلندی" اس نے جواب دیا "آپ کو حیرت ہوگی کہ یہاں تیاگ میں کوئی ذہنی بیماری نہیں ہوتی۔ ذہنی بیماریاں نیچے جنم لیتی ہیں، وادیوں میں، میدانوں میں۔

ایک بات یقینی ہے، ذہنی بیماری "میں" سے پھوٹتی ہے۔ "میں" میں گرہیں لگ جاتی ہیں۔ آپ ایک سال یہاں قیام کریں۔ ساری گرہیں کھل جائیں گی۔ آپ ہی آپ ڈنک نکل جائیں گے۔ دھاریں کند ہو جائیں گی۔"

میں خالد کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس میں سے ایک عجیب سا اطمینان چھن چھن کر کمرے کی فضا کو منور کیے جا رہا تھا۔ اس کی باتیں میرے لیے بڑی انوکھی تھیں۔ میری "میں" بلبلی ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے ایک شدید کوشش کی۔ اُٹھ بیٹھی۔ "تھینک یو ڈاکٹر۔"

اُس رات میں اپنے کمرے کی ٹیرس پر بیٹھی رہی۔ بیٹھی رہی۔ پتا نہیں کب تک بیٹھی رہی۔ میں محسوس کر رہی تھی جیسے میرا وزن کم ہوتا جا رہا ہو۔ میرا تعلق دھرتی سے کٹتا جا رہا ہو۔

اگلے روز ڈاکٹر خالد نے کہا "میں نے آپ کا کیس سٹڈی کیا ہے۔ میرا خیال ہے، آپ دو ہفتے میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ آج سے آپ کا علاج شروع ہو جائے گا۔ علاج شروع کرنے سے پہلے آپ کو ایک فارمیلٹی ادا کرنا ہو گی۔ یہ ایک حلف ہے۔" اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ اُٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ایک تو ہاتھ اُٹھا کر یہ حلف پڑھیے اور دوسرے اس فارم پر دستخط کر دیجیے۔"

"نہیں، ڈاکٹر صاحب۔ میں حلف نہیں اُٹھاؤں گی۔" میں نے روکھا جواب دیا۔

اسے یہ سُن کر ایک دھچکا سا لگا۔ کہنے لگا "محترمہ، یہ تو ایک فارمیلٹی ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب" میں نے کہا "میں اپنی میں کسی کے حوالے نہیں کر سکتی۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس حیرت میں ستائش بھی شامل تھی۔ میں نے جواب میں ایک بھرپور نگاہ چھلکائی، لیکن خالد پر کلف تھا ہی نہیں جو ٹوٹتا۔ ہاں ذرا سا لڑکھڑایا ضرور تھا۔

کہنے لگا "مسز سلمان، تمام ذہنی بیماریاں "میں" سے پھوٹتی ہیں۔ یا تو "میں" میں

گرہیں لگ جاتی ہیں یا دراڑیں پڑ جاتی ہیں، یا کانٹے اُگ آتے ہیں۔ اس لیے 'میں' کو تیاگے بغیر شفا نہیں ہوتی۔"

"نہ ہو، شفا" میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے سمجھانے لگا۔ بولا "سائیکی ایٹری میں بھی ڈاکٹر مریض کی توجہ ذات کی جانب سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مریض لڑکیوں کو ڈاکٹر سے محبّت ہو جاتی ہے۔"

مجھے اس پر غصّہ آ گیا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر خالد، میں اتنی دُور چل کر آپ سے محبّت رچانے نہیں آئی۔" پھر میں نے ایک ایسی نظر اس پر ڈالی جس کا مطلب تھا، آپ بے شک مجھ سے محبّت نہ رچائیں۔

وہ گھبرا گیا۔ کہنے لگا "اچھا، آپ یوں کریں کہ آٹھ دس روز یہاں قیام کریں اور اس مسئلے پر سوچیں۔ شاید —" وہ رُک گیا۔

"کیا آپ حلف لیے بغیر علاج شروع نہیں کر سکتے؟" میں نے پُوچھا۔

"حلف علاج کا ایک حصّہ ہے، اہم ترین حصّہ" وہ چڑ کر بولا۔

"خُدا حافظ!" میں اُٹھ بیٹھی۔

شام کے وقت جب میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی تو دروازہ بجا۔ میں نے بن سوچے سمجھے کہہ دیا: کم اِن۔ میرے سامنے ڈاکٹر خالد کھڑا تھا۔

"بیٹھیے" میں نے کہا۔ میرا خیال تھا وہ پوچھے گا: کہیے، آپ نے کیا فیصلہ کیا۔ لیکن اس نے آتے ہی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ بولا "وہ سامنے ٹیلے پر جو جنگل ہے، اُس جنگل میں عجیب و غریب قسم کے مشروم اُگتے ہیں۔ مثلاً ایک مشروم ہے جو ٹہلتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پُوچھا۔

"ایک فٹ کے دائرے میں ٹہلتا ہے۔ صبح یہاں ہے، دوپہر کو آدھ فٹ سرکا ہُوا،

شام کو پورا ایک فٹ ۔"

میں ہنسی "اب مجھے الف لیلوی کہانیاں نہ سنائیے ۔"

وہ مسکرایا۔ بولا "حقیقت ، رئیلیٹی ، آدھی سے زیادہ الف لیلوی ہے ۔ آپ خود الف لیلوی برتاؤ بیت رہی ہیں ۔"

"کون سا برتاؤ ؟"

" دو رُخی برتاؤ" اُس نے جواب دیا ۔ اس کے بعد دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے ۔ پھر وہ مجھے عجیب و غریب قسم کے مشرومز کے متعلق بتاتا رہا ۔

جب وہ جانے لگا تو میں نے پُوچھا "آپ مشرومز سے علاج کرتے ہیں ؟"

کہنے لگا " ہاں ۔ بیشتر ۔"

میں نے پُوچھا " مشروم کیسا اثر رکھتا ہے ؟"

کہنے لگا "سب سے پہلے مریض کو ہم وہ مشروم دیتے ہیں جو مریض کی میں سے پھونک نکال دے ۔" یہ کہتے ہُوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا ۔

اُسی رات خانساماں کھانا لے کر آیا تو کہنے لگا " بیگم صاحبہ ، ڈاکٹر خالد کبھی ہوسٹل میں نہیں آئے تھے ۔ آج پہلی مرتبہ انھیں ہوسٹل میں دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا ۔" خانساماں کی بات سُن کر میری "میں" میں پھونک اور بڑھ گئی ۔

اگلے روز شام کو وہ پھر آ گیا ۔

میں نے پُوچھا "ڈاکٹر ، آپ شادی شدہ ہیں کیا ؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا ۔ کہنے لگا "میں لیڈی ڈاکٹر سے شادی کروں گا ، جو ہمارے طریقِ علاج کو اپنا لے ۔"

میں نے اسے چھیڑا " اور اپنی "میں" چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر آپ کو بھینٹ کر دے ۔"

"نہیں" وہ مسکرایا "میں اپنی 'میں' چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر اسے پیش کروں اور وہ اسے قبول کرلے۔ محترمہ" وہ بولا "محبت کیا ہے؟ اپنی دِل سرنڈر کردینا۔ اپنی میں دُوسرے کے تابع کردینا۔"

"ساری دُنیا محبت کرتی ہے" میں نے طنزاً کہا "لیکن ——"

"اُونہوں! وہ محبت نہیں ہوتی، خواہش ہوتی ہے، حرص ہوتی ہے۔ اور زیادہ تر محبوب سے نہیں بلکہ اپنی انا سے محبت ہوتی ہے۔ محبوب تو ایک بہانہ ہوتا ہے۔ ایک پردہ ہوتا ہے۔ ایک ڈیلوژن۔ آپ سمجھتی ہیں کہ آپ نے سلمان سے محبت کی ہے۔ اگر آپ سچے دل سے سلمان سے محبت کرتیں تو دو رُخی مدت سے ختم ہو چکی ہوتی۔ آپ کو تیاگ میں آنے کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔"

پھر دفعتہً اس نے موضوع بدلا۔ کہنے لگا "صبح کے وقت آپ کیا کرتی ہیں؟ کلینک میں آجایا کیجیے۔ مریضوں کی کیس ہسٹریاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ دلچسپ اور بصیرت افروز۔"

اگلے روز میں کلینک میں جا بیٹھی۔ ڈاکٹر خالد مجھے دیکھ کر بہت خوش ہُوا، لیکن اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ کہنے لگا "آج ایک ہی مریض ہے۔ بہت دُور سے آیا ہے۔ بہت بڑا عابد ہے۔"

"کیا تکلیف ہے، اُسے؟" میں نے پُوچھا۔

"پتا نہیں" وہ بولا "ابھی آکر آپ کے سامنے بیان کرے گا۔"

عین اس وقت ایک باریش نورانی شخص کمرے میں داخل ہُوا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام" ڈاکٹر نے جواب دیا "تشریف رکھیے۔ فرمایئے، آپ کس لیے تشریف لائے ہیں؟"

بُوڑھے نے بامعنی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

"یہ میری اسسٹنٹ ہیں" ڈاکٹر خالد نے کہا۔

یہ سُن کر بُوڑھا مطمئن ہو گیا۔

"فرمائیے ؟" ڈاکٹر نے کہا۔

بُوڑھے نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں کہا "میری آپ بیتی بہت مختصر ہے۔"

"جی، فرمائیے" خالد بولا۔

"میں نے گزشتہ بیس سال تخلیے میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کی ہے، بیس سال" اس کی آواز جذبات کی شدت سے کانپی۔ وہ رُک گیا۔ کمرے میں گہری بوجھل خاموشی چھا گئی۔ "صدیاں گزر گئیں ــــ لیکن" اس کی آواز پھر گونجی ــــ "لیکن ــــ میں آج تک اللہ کو نہیں مان پایا۔ کوشش کے باوجود نہیں مان پایا۔ میں اس کے وجود کو دل سے قبول نہیں کر سکا" کمرے میں پھر سے بوجھل خاموشی چھا گئی۔

مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے سر پہ پتھر دے مارا ہو۔ میری آنکھوں میں تارے ناچے اور پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ بُوڑھا جا چکا ہے اور خالد سر جُھکائے بیٹھا ہے۔

"ڈاکٹر خالد" میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ بولا "فرمائیے ؟"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے" میں نے جواب دیا۔

"کیا ؟" وہ بولا۔

"میں کل صبح واپس جا رہی ہوں۔"

"میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے" ڈاکٹر خالد نے کہا۔

"کیا ؟" میں نے پُوچھا۔

"ہم حلف لیے بغیر آپ کا علاج کریں گے۔"

میں اُٹھ بیٹھی۔ "شکریہ، ڈاکٹر۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

"تو کیا آپ علاج نہیں کرائیں گی ؟"

"نہیں" میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "اگر اپنی دِل ہی سرنڈر کرنا ہے تو میں اس کی بھینٹ کیوں نہ کروں جس کے پردے میں مَیں نے دو سال ٹوٹ کر اپنی انا سے محبت کی ہے ۔ خُدا حافِظ ، ڈاکٹر !"

رُکاوٹ

ہاؤ ڈل اینڈ ڈریب۔

دن چڑھتا ہے تو سوچتی ہوں کہ کیسے ختم ہوگا، اتنا لمبا پہاڑ سا دِن۔ وقت کاٹنا مشکل ہو رہا ہے۔ زندگی میں وہ چارم نہیں رہا۔ مچ ایڈو اباؤٹ نتھنگ۔ دراصل کسی بات کا چاؤ نہیں رہا۔ کیوراسٹی نہیں رہی۔ اندر کا وہ بچہ نہیں رہا جو بات بات پر حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا۔ دی چائلڈ ہو سٹڈ ران ہر شوز اینڈ ونڈرڈ۔

پتا نہیں کیا ہوگیا ہے! کیوں؟ ایسے لگتا ہے جیسے خوش بُو اور رنگ اُڑ گئے ہوں اور خالی پھُول کی پتّیاں رہ گئی ہوں۔ جیسے سانس میں بائیٹ نہ رہی ہو۔

سوچتی ہوں ابھی تو ابتدا ہی تھی۔ زندگی میں داخل ہُوئے تین چار سال ہی ہُوئے تھے۔ ابھی سے ایسا کیوں ہوگیا!

ایک وہ دن تھے جب بڑے چاؤ سے زندگی میں قدم رکھا تھا۔ مائی گاڈ! کیا دِن تھے وہ! اِرد گرد چاروں طرف مینا بازار لگا ہُوا تھا۔ رونقیں، دل چسپیاں، رنگینیاں، ایکسائیٹمنٹ۔ بس ایک ہی خواہش تھی کہ اس رنگ رنگیلے میلے میں آزادی سے گھُوموں۔ ایکسائیٹمنٹ سے چھن چھن کرتی پھِروں۔ کوئی روک نہ ہو، ٹوک نہ ہو۔ کوئی پُوچھنے والا نہ ہو۔ جو چاہوں کروں۔ رنگیلی بتّیوں سے جھولی بھرلوں۔ خود کی موم بتّی کو دونوں سروں پر جلائے رکھوں۔ اک تماشا لگائے رکھوں۔

راہ چلتوں کو ٹٹولوں۔ آنکھوں میں جھانک کر دیکھوں۔ کیا یہ وہی تو نہیں؟

میرا ساتھی، ہمراہی جو میرے بغیر آدھا ہے۔ جیسے میں پورا کرنے کے لیے آئی ہوں۔

ان دنوں بس ایک ہی خواہش تھی۔ ایک آرزو ــــــ آزادی۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کی تمام تر رنگینیاں میری منتظر تھیں۔ بس رکاوٹ ختم ہونے کی دیر تھی۔ اور میرا گھر رکاوٹ ہی رکاوٹ تھا۔

ممی اور ڈیڈی بھی عجیب جوڑا تھے۔ ممی پھسلن ہی پھسلن، ڈیڈی روک ہی روک۔ ممی موومنٹ کی دیوانی، ڈیڈی سٹیبلٹی کے رسیا۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے، پر دُور دُور چلتے تھے۔

بے چاری ممی ــــــ اس نے ڈوئلٹی پال رکھی تھی۔ میاں کے بورڈم سے بچنے کا کوئی راستہ بھی ہوتا۔ یہ ڈوئلٹی تربوز ایسی تھی۔ اُوپر سے ہری ہری، اندر سے لال لال ــــــ ڈیڈی بہت ہی سٹریٹ فارورڈ تھے۔ باہر اندر کا کچھ پتا ہی نہ تھا۔ انھوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ باہر ہرا ہو اور اندر لال۔ انھیں پتا ہی نہ تھا کہ ممی دھوپ چھاؤں بھی رہی ہے۔ مجھے ڈیڈی سخت ناپسند تھے۔ خوامخواہ کی رکاوٹیں کھڑی کرتے رہتے۔ دوسروں کے لیے بھی۔ اپنے لیے بھی۔

مجھے ممی بھی پسند نہ تھی۔ اُونہوں! یہ کیا ہُوا کہ اندر سے کچھ، باہر سے کچھ۔ جو جینا ہے تو کھُل کر جیو، علانیہ جیو۔ اپنی کنوکشنز پر شرمانا کیوں، پردے کیوں، وہ تو ہپوکریسی ہوئی نا۔ اُونہوں! مجھے پردے اچھے نہیں لگتے۔ ملفوف کرداروں سے مجھے چڑ ہے۔ میں کہتی ہوں یا تو بھڑک کر جیو اور اگر جرأت نہیں تو پھر بجھے رہو۔

پتا نہیں کیوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا بچپن پابندیوں اور رکاوٹوں میں گزرا۔ دل میں پابندیوں کے خلاف لاوا اُبلتا رہا۔ ریوولٹ کا جذبہ پلتا رہا۔ مجھے بڑی ہو لینے دو، پھر دیکھوں گی کون میرا راستہ روکتا ہے۔ ان دنوں زندگی میں صرف ایک آرزو تھی، ایک خواہش ایک جنون ــــــ آزادی۔

پھر ـــــ دفعتہً آزادی مل گئی۔

یوں جیسے کسی نے کھُل جا سم سم کہ دیا ہو۔ میرے سامنے ہیرے جواہرات سے جگ مگ کرتا غار کھلا پڑا تھا۔ میں تو ہکّی بکّی رہ گئی!

ہوا یہ کہ بیٹھے بٹھائے ڈیڈی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ہم نے ہسپتال کی طرف رُخ کیا۔ لیکن وہ ہسپتال تک نہ پہنچ سکے۔

اس کے بعد کئی دنوں تک کانڈولینسز کا سلسلہ جاری رہا۔ لوگ آتے رہے، جاتے رہے۔ دکھاوے کے رکھاؤ۔ جھوٹے آنسو۔ رسمی ہنگامہ۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ گھر میں ہم دو اکیلے رہ گئے۔ ممی اور میں۔ چند روز تو ہم ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ پھر ممی نے آنسو پونچھے۔ نیا ہیر سٹائل بنوایا، میک اَپ کیا اور باہر نکل گئیں۔ ان کے سوشل کا ئنٹ کچھ زیادہ ہی بڑھ گئے، اور کلچرل ایکٹیویٹیز میں کلچر کم اور ایکٹیویٹی کا عنصر بڑھ گیا۔

زندگی بھر دل میں سُلگتی آرزو دفعتہً پوری ہو جائے تو انسان نان پلسڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں بھی کئی ایک دن نان پلسڈ بیٹھی رہی۔

پھر ہوش آیا تو میں نے زندگی کے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ایکسائیٹمنٹ کے ایک طوفان نے مجھے اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ تھپیڑے جھولنے بن گئے۔ بند بند جھُن جھُن کرنے لگا۔ میری گوراؤنڈ کچھ زیادہ ہی میری ہو گیا۔

حسین تو خیر میں تھی نہیں۔ نہ ہی خواہش تھی۔ میری دو ایک سہیلیاں تھیں جو بنی سجی گڑیوں کی طرح بے جان تھیں۔ ہاں، مجھ میں ایک چارم تھا۔ پتا نہیں کہاں تھا۔ خدوخال میں، چال ڈھال میں، یا بیرنگ میں۔ بس مجھے تو یہی پتا تھا کہ تھا۔

سرِ راہ جو بھی دیکھتا چونکتا۔ دو ایک قدم چلتا، پھر مڑ کر دیکھتا۔ محفل میں لوگ آنے بہانے گرد ڈھیر لگا لیتے۔ گفتگو میں مَیں نے چونکا دینے کا طریقِ واردات اپنا رکھا تھا۔ بات بات پر خود پہ الزام دھرتی۔ اپنی کمیاں کجیاں نمک مرچ لگا کر بیان کرتی۔ وہ وہ باتیں

جو نہیں کہی جاتیں، بڑی معصومیت سے کہہ دیتی۔

اِک بات بتا دوں۔ مجھے چیپ نس سے چِڑ تھی۔ چیپ باتیں، حرکتیں، چیپ لوگ بُرے لگتے۔ چیپ ریلیشنز بالکل گوارہ نہ تھے۔ پر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ایکسائٹمنٹ تو خود چیپنس ہے۔ یہ تو ایک پرکیف لرزش ہے۔ پلیزنٹ وائبریشن۔ یہ وائبریشن باہر کے مضراب سے پیدا نہیں ہوتی۔ اندر کے تاروں کے تناؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اندر کا تناؤ حوالگی سے نہیں بلکہ رُک جانے سے بڑھتا ہے، قائم رہتا ہے۔ ایکسائٹمنٹ کے پیچھے بھاگو تو اندر کا تناؤ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ چھن چھن میں وہ لذت نہیں رہتی۔ دُور رہو بھاگو تو بڑھتا ہے۔ چھن چھن میں ترنگ پیدا ہوتی ہے۔

ایکسائٹمنٹ چاہے معصوم باتوں سے اخذ کرو، چاہے سرسری ملاپ سے۔ وہ ہر پھر کر اسی نقطۂ عروج پر لے جاتی ہے۔ انگ انگ میں اِک پھلجھڑی چل جاتی ہے۔ پھر ایک ہوائی زُوں سے چھوٹ جاتی ہے، اور پھر رنگین بادلوں سے دھڑام سے زمین پر آ گرتی ہے۔ لاش کی طرح۔

ایکسائٹمنٹ کی تلاش میں بار بار میرے اندر پھلجھڑیاں چلیں۔ ہوائیاں چھوٹیں۔ رنگین بادلوں میں جھولنے جھولی۔ اور پھر زمین پر آ گری۔ گرتی رہی، گرتی رہی۔

ساتھی کی ڈھونڈ میں مَیں نے کئی ایک آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہ ایک ملاپ بھی ہوئے۔ وہ تو ہوتے ہی ہیں۔ کھرا کھوٹا جاننے کے لیے سکہ بجانا ہی پڑتا ہے۔ اور بجاؤ تو ساتھ خود بھی بجنا پڑتا ہے۔

خیر ــــــ پھر ایک ساتھی بھی مل گیا جیسا کہ میں چاہتی تھی۔ امان کے راستے میں بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ باپ کویت میں ملازمت کرتا تھا۔ ماں اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے جی رہی تھی۔ اسے امان کی ہر بات پسند تھی۔ اسے مکمل آزادی دے رکھی تھی۔

بہرحال، وہ امان تھا، میں آمن تھی۔ نام بھی ایک سے، طبیعتیں بھی ایک سی۔ ویسے میرا اصلی نام تو آمنہ تھا، پر مجھے یہ نام پسند نہ تھا۔ اس میں سے مذہب کی بُو آتی تھی۔

جو نہیں کہی جاتیں، بڑی معصومیت سے کہہ دیتی۔

اِک بات بتا دوں۔ مجھے چیپ نس سے چِڑ تھی۔ چیپ باتیں، حرکتیں، چیپ لوگ بُرے لگتے۔ چیپ ریلیشنز بالکل گوارہ نہ تھے۔ پر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ایکسائیٹمنٹ تو خود چیپنس ہے۔ یہ تو ایک پرکیف لرزش ہے۔ پلیزنٹ وائبریشن۔ یہ وائبریشن باہر کے مضراب سے پیدا نہیں ہوتی۔ اندر کے تاروں کے تناؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اندر کا تناؤ حوالگی سے نہیں بلکہ رُک جانے سے بڑھتا ہے، قائم رہتا ہے۔ ایکسائیٹمنٹ کے پیچھے بھاگو تو اندر کا تناؤ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ جھن جھن میں وہ لذت نہیں رہتی۔ دُور بھاگو تو بڑھتا ہے۔ جھن جھن میں ترنگ پیدا ہوتی ہے۔

ایکسائیٹمنٹ چاہے معصوم باتوں سے اخذ کرو، چاہے سرسری ملاپ سے۔ وہ ہر پھر کر اسی نقطۂ عروج پر لے جاتی ہے۔ انگ انگ میں اِک پھلجھڑی چل جاتی ہے۔ پھر ایک ہوائی زُوں سے چھوٹ جاتی ہے، اور پھر رنگین بادلوں سے دھڑام سے زمین پر آ گرتی ہے۔ لاش کی طرح۔

ایکسائیٹمنٹ کی تلاش میں بار بار میرے اندر پھلجھڑیاں چلیں۔ ہوائیاں چھوٹیں۔ رنگین بادلوں میں بھول بھلیاں کھیلی۔ اور پھر زمین پر آ گری۔ گرتی رہی، گرتی رہی۔

ساتھی کی ڈھونڈ میں مَیں نے کئی ایک آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ دو ایک ملاپ بھی ہوئے۔ وہ تو ہوتے ہی ہیں۔ کھرا کھوٹا جاننے کے لیے سکّہ بجانا ہی پڑتا ہے۔ اور بجاؤ تو ساتھ خود بھی بجنا پڑتا ہے۔

خیر ـــــ پھر ایک ساتھی بھی مل گیا جیسا کہ میں چاہتی تھی۔ امان کے راستے میں بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ باپ کویت میں ملازمت کرتا تھا۔ ماں اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے جی رہی تھی۔ اسے امان کی ہر بات پسند تھی۔ اسے مکمل آزادی دے رکھی تھی۔

بہرحال، وہ امان تھا، میں آمن تھی۔ نام بھی ایک سے، طبیعتیں بھی ایک سی۔ ویسے میرا اصلی نام تو آمنہ تھا، پر مجھے یہ نام پسند نہ تھا۔ اس میں سے مذہب کی بُو آتی تھی۔

مجھے مذہب پسند نہ تھا۔ رکاوٹیں ہی رکاوٹیں۔ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ یوں کرو، وؤں نہ کرو۔ جسے آزادی کی دُھن لگی ہو وہ بھلا مذہب کو کیسے اچھا جانے۔ اچھا جاننا تو اور بات ہے، میں تو اُلٹا مذہب پر شرمندہ شرمندہ رہتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ مذہب تو ایک پرسنل میٹر ہے۔ میں جانوں، میرا خدا جانے۔ دُوسروں کو بیچ میں دخل دینے کا مطلب؟

پھر یہ بھی تھا کہ آمنہ متبرک نام تھا۔ بچپن میں ہی جب لوگ مجھے آمنہ کہہ کر بلاتے تو میں محسوس کرتی جیسے میں تبرک ہوں۔ اور تبرک تو خانقاہوں میں بٹتے ہیں۔ مجھے خود سے مشک کافور کی بُو آنے لگتی۔ جب بڑی ہوئی تو میں نے آمنہ کی جگہ اپنا نام آمن رکھ لیا۔ اس چھوٹی سی تبدیلی سے کتنا فرق پڑ گیا۔ نہ تبرک رہا، نہ خانقاہ رہی، نہ مشک کافور کی بو۔ بالکل ہی سیکولر بن گئی۔

ہاں تو امان بھی میری طرح رکاوٹوں کا بیری تھا۔ قدبُت اچھا، رنگ کُھلا کھلا اور آنکھیں ——— آنکھیں جیسے بھولنے ہوں۔ ایک نگاہ ڈالے تو بھولن لگو۔ اور پھر آنکھوں سے ایک پھوار سی اُڑتی جو بھگو دیتی۔ اتنی بھیگ اتنی بھیگ کہ ڈوب جاؤ۔

امان سے ملی تو ایسی بھیگی ایسی بھیگی کہ پروں میں اڑان نہ رہی۔ اس پر مجھے بہت غصّہ آیا۔ نہیں۔ میں کسی کو اپنی آزادی سلب کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ ٹھیک ہے وہ بڑا اٹریکٹو ہے، چارمنگ ہے، اچھا ساتھی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ میری اڑان کو سلب کر لے۔ مجھے ڈی سلفٹ کر دے۔

میں نے اسے ایک چیلنج مان لیا۔

لیکن جلد ہی اس کی مُسکان بھری نگاہوں نے مجھے انڈے کی طرح پھینٹ کر رکھ دیا۔ اور پھر اس پھینٹ سے حوالگی کی خواہش کی جھاگ ابھری، اُبھرتی گئی، اُبھرتی گئی۔ اور ان جانے میں ہم ایک دُوسرے سے پیوست ہوتے گئے، ہوتے گئے۔ یوں کہ ایک ہو گئے۔ جیسے ٹچ بٹن کے دونوں حصّے ٹچ کر کے ایک ہو جاتے ہیں۔

کئی ہفتے بلکہ مہینے ایکسائیٹمنٹ کے گھنگھرو بجتے رہے۔ لے بڑھتی رہی۔ تال بلمپت سے

درت ہوگئی۔ رقص تیز سے اور تیز، اور تیز۔

کوئی روک نہ تھی ٹوک نہ تھی۔ ممی بُرا ماننے کی بجائے شہ دیتی تھی۔ امان جب چاہتا گھر آجاتا۔ ممی نے پوری پرائیویسی دے رکھی تھی۔ مجھے پتا نہ تھا کہ اتنی آزادی ویرانے میں لے جاتی ہے۔ ملاپ کا تواتر بے زاری پیدا کر دیتا ہے۔

ہم اب بھی ملتے ہیں۔ امان بلاناغہ آتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں کی پھوار میں وہ بھیگ نہیں۔ نظروں میں وہ جھولنے نہیں رہے۔ اس کی ہیلو میں وہ والہانہ پن نہیں رہا۔ وہ انبساط نہیں رہی۔ جیسے کچھ پالیا ہو۔ کوئی انمول چیز۔

قریب ہوتا ہے، لیکن جیسے سرسری ہو۔

خوشی ہوتی ہے لیکن بُلبلے نہیں اُٹھتے۔ وہ سنہرا دھندلکا پیدا نہیں ہوتا۔

تار ہلتے ہیں لیکن ان میں وہ تناؤ نہیں رہا۔ گھنگھرو چھن چھن نہیں کرتے۔ تال درت سے پھر بلمپت ہو گئی ہے۔

ہم دونوں کے ملاپ سے جو بھیڑ پیدا ہوتی تھی، نہیں رہی۔ میلہ نہیں لگتا۔ ملاقات روٹین میں بدل گئی ہے۔

جب امان چلا جاتا ہے تو میں بالکل ڈل اینڈ ڈرب ہو کر رہ جاتی ہوں۔ پھر وقت ہینگ کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی میں وہ چارم نہیں رہا۔

ٹھہریے! اس کے پاؤں کی چاپ سنائی دے رہی ہے ـــــ ہاں، وہی ہے ــ وہی ـــــ چال کچھ بدلی بدلی سی لگتی ہے۔ ریلیکسڈ نہیں۔

اب وہ ناک کر رہا ہے ـــــ یس، کم اِن۔ ہاں کچھ بدلا بدلا سا ہے۔

وہ دھڑام سے کرسی پر بیٹھ گیا ہے۔ اسے ایسے دیکھ کر میں گھبرا گئی ہوں۔

"ہمن، بیڈ نیوز" وہ کہتا ہے۔

میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے اور میں متوقع نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوں۔

"کل اچانک ابّا کویت سے آ گئے ہیں۔"

"پھر؟" میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہُوں۔

"انھوں نے آتے ہی اعلان کر دیا ہے کہ میں امان کی شادی کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

ایک ساعت کے لیے میں سُن ہو کر رہ جاتی ہُوں۔

اس کا سر لٹکا ہُوا ہے، جیسے سوچ میں ڈوبا ہُوا ہو۔

وقت تھم گیا ہے۔ سارا کمرا گھومنے لگا ہے۔

اندر ایک تناؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

دفعتہً وہ سر اُٹھاتا ہے۔ اپنی نگاہیں مجھ پر مرکوز کر دیتا ہے۔ ایک ساعت کے لیے اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی ہیں۔ پھر وہ اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اس کی نگاہوں سے پھوار کا ایک طوفان اُمڈتا ہے۔ وہی پھوار جو بھگو کر رکھ دیتی ہے۔ اُڑان کو سلب کر لیتی ہے۔

"نہیں نہیں" وہ کہتا ہے "ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا، آمن، کبھی نہیں۔"

میرے اندر اک بھیڑ سی لگ جاتی ہے۔ سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ چلاتا ہے "آمن، تم میرے ابا کو نہیں جانتیں۔ تُم نہیں سمجھو گی۔ ہماری راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ حائل ہو گئی ہے۔ بہت بڑی رکاوٹ" وہ چیختا ہے۔

مُجھے ایسے لگتا ہے جیسے وہ دُکھ کی نہیں بلکہ فرطِ اِنبساط کی چیخ ہو۔ اس کی نگاہوں میں تکرار، غصّے کی بجائے کیف کی پُھلجھڑیاں چل رہی ہوں۔

مجھے یُوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے دل کی سُوکھی ہُوئی پتّیاں پھر سے ہری ہو رہی ہوں۔

کس لیے؟ کیا اس لیے؟

ہائیں پھر! —— پھر وہی علی کالج - یہ میں ادھر کیسے چلا آیا؟

یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسلام آباد میں گھومتے پھرتے ہر دُوسرے چوتھے دن اَن جانے میں مَیں خود کو علی کالج کے سامنے کھڑا پاتا ہوں۔ پتا نہیں کیسے اَن جانے میں ادھر جا نکلتا ہوں! کھڑا ہو کر کالج کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہُوں، دیکھتا رہتا ہوں —— پھر کسی آواز پر چونکتا ہوں۔ خود کو وہاں پا کر حیران ہوتا ہوں۔ یہ میں ادھر کیسے پہنچ گیا!

میرا نام اِمتیاز ہے۔ میں ایک نارمل آدمی ہُوں۔ زندگی میں کوئی اُلجھن نہیں۔ کوئی کشمکش نہیں۔ شادی شدہ ہُوں۔ مجھے آنا سے پیار ہے۔ فرزانہ میری بیوی ہے۔ میں اسے آنا کہہ کر بُلاتا ہُوں۔ گھر میں کوئی پرابلم نہیں۔ کوئی تلخی نہیں۔ کوئی دکھاوا نہیں۔ آنا بہت ہی پیاری بیوی ہے۔ پہلے میں فیصل آباد میں اسسٹنٹ تھا۔ تنخواہ کم تھی۔ لیکن گزارہ ہو جاتا تھا۔ بس آنا میں ایک نقص ہے۔ اسے ایک لگن لگی رہتی ہے کہ ہمارے بچّے اچھّی تعلیم پائیں۔ کانونٹ سکول میں پڑھیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ بڑے ہو کر کچھ بنیں۔

اس خواہش کے زیرِاثر وہ مجھے اُکساتی رہی: کچھ کرو، امتیاز، کچھ کرو۔ اسسٹنٹ بن کر بیٹھ رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم بچّوں کو انگریزی سکول میں داخل نہیں کرا سکیں گے۔ کلرکوں کی آبادی بڑھانے سے فائدہ؟

آنا مجھے اُکساتی رہی، اُکساتی رہی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ میں مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتا رہا، اور کامیاب ہو گیا۔ اب یہاں اسلام آباد میں میری تعیناتی ہو گئی ہے۔ افسر بن گیا ہُوں۔

چارج لے لیا ہے۔ مکان کی تلاش کر رہا ہوں۔ مکان ملے تو آنا اور بچوں کو فیصل آباد سے لے آؤں۔

یہاں، اسلام آباد میں، مکان کی بڑی مشکل ہے۔ ملتے تو ہیں پر کرائے بہت زیادہ ہیں۔ ایک مہینا ہو گیا ہے مجھے اسلام آباد میں جوتے چٹخاتے ہوئے۔

اُدھر، ایف سیون میں، علی کاٹج دیر سے خالی پڑا ہے۔ بہت بڑا بنگلا ہے۔ بنگلا دیکھ کر جرأت نہ ہوئی کہ کرایہ پوچھوں۔ تین ہزار سے کم کیا ہو گا۔ میری دسترس سے باہر ہے۔

ایک روز کھڑا باہر سے بنگلے کو حسرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک بوڑھے میاں آ گئے۔ بولے: صاحب جی، کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ بنگلا رہائش کے قابل نہیں ہے۔ آسیب زدہ مکان ہے۔ اسے کوئی کرائے پر نہیں لے گا۔ دو سال سے خالی پڑا ہے۔ دو ایک کرایہ دار آئے تھے۔ چار ایک دن ٹھہرے، پھر بھاگ گئے۔

"کیا کرایہ ہو گا اس کا، بڑے میاں؟" میں نے پوچھا۔

"کرائے کی بات نہیں" وہ بولا "مالکِ مکان تو مفت دینے کے لیے تیار ہے تاکہ مکان آباد ہو جائے۔"

بس اس دن سے یہی کیفیت ہے۔ میں مکان کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہوں۔ چاہے ایف ایٹ کی طرف جاؤں یا جی ناین کی طرف۔ گھومتے پھرتے دفعتہً کیا دیکھتا ہوں کہ ایف سیون میں علی کاٹج کے سامنے کھڑا ہوں۔ چونکتا ہوں۔ حیران ہوتا ہوں۔ یہ میں ادھر کیسے نکل آیا!

ایسے لگتا ہے جیسے علی کاٹج سے میرا گہرا تعلق ہے۔ جیسے علی کاٹج مجھے بلا رہا ہے۔ اسے مجھ سے کچھ کہنا ہے۔ جیسے وہ میرا منتظر ہے۔

پہلے تو یہ خیال میرے دل کی گہرائیوں میں دبکا بیٹھا رہا، پھر ایک روز اچھل کر ذہن میں آ گیا۔ میں نے کئی بار اسے ذہن سے نکالا۔ تالی مار اڑانے کی کوشش کی۔ لاحول پڑھتا رہا۔

لیکن وہ میرے ذہن میں میخ کی طرح گڑ گیا۔ کسی صورت میں اسے ذہن سے نکال نہ سکا۔ مجبوراً مجھے اس خیال کو اپنانا پڑا۔ کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے تسلیم کر لیا۔ سچے دل سے تسلیم کر لیا کہ علی کالج کا میری زندگی سے گہرا تعلق ہے اور اس حقیقت کو نظرانداز کرنا عبث ہے، لاحاصل ہے۔

اس پر میرے دل میں ایک اَن جانی جُرأت پیدا ہو گئی۔ ویسے فطری طور پر میں ایک ڈرپوک آدمی ہُوں۔ اُونہوں! حقائق سے نہیں ڈرتا، لیکن غیر مرئی چیزوں سے بہت ڈرتا ہوں۔ جنّات سے ڈرتا ہُوں۔ ارواح سے ڈرتا ہُوں۔ کسی ہانٹڈ ہاؤس میں رہنا میرے لیے ممکن نہیں۔ لیکن اس روز مجھ میں گویا ایک انجانی قوّت پیدا ہو گئی۔ میں نے سوچا، چلو چل کر علی کالج کے بارے میں کچھ اتا پتا لگاؤ۔ چوکیدار سے ملو۔ اس سے پُوچھو۔

اس دوران میں مجھے علم ہو چکا تھا کہ علی کالج میں ایک چوکیدار رہتا ہے، جو دن کے وقت محنت مزدوری کرتا ہے اور رات کو بنگلے میں آ کر پڑ رہتا ہے۔ اس کا نام فضلوُ ہے۔ فضلو سے کبھی میری مٹھ بھیڑ نہ ہُوئی تھی۔ شام کو وہ گھر پر نہیں ہوتا تھا، اس لیے میں نے سوچا، رات کے وقت وہاں جاؤں۔ فضلُو سے ملوں۔ بات کروں۔ پاس بیٹھوں۔ شاید کُچھ اتا پتا چلے۔

میں نے فضلُو سے ملنے کا منصوبہ بنایا۔ کھدر کا ایک میلا جوڑا پہنا، ہاتھ میں ایک بیگ لیا اور علی کالج کی طرف چل پڑا۔

فضلُو ساٹھ سال کا بوڑھا آدمی تھا۔ اس کی پیشانی پر ایک مستقل گھوری تھی۔ رنگ کالا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے لوہے کا بنا ہُوا ہو۔ آنکھیں اندر دھنسی ہُوئی تھیں۔ وہ دیکھتا نہیں تھا، گھورتا تھا۔ آواز کرخت تھی۔ لہجہ رُہتکی تھا۔ غالباً وہیں کا رہنے والا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کے ماتھے کی تیوری اور اُبھر آئی۔ آنکھیں اور دھنس گئیں۔ "کون ہے تُو؟" اس کی آواز میں بھی لوہے کی کھنک تھی۔

"مُسافر ہُوں۔ رات کاٹنے کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں" میں نے کہا۔

اُس نے ایک کر لالٹین اُٹھائی اور میری طرف گھورنے لگا "تُو تو بابو ہے، رے"

وہ بولا۔

"ہاں، بابو ہوں" میں نے کہا "میرے ایک دوست نے چٹھی لکھ کر مجھے بُلایا تھا۔ یہاں آیا تو پتا چلا کہ وہ مکان چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اگر آج کی رات کے لیے تو مجھے ٹھکانا دے دے تو کل میں کوئی انتظام کر لوں گا۔"

"تُو رات یہاں گزارے گا؟ اس بنگلے ماں؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا "بس مجھے ایک چارپائی دے دے۔ اس پر پڑا رہوں گا۔"

وہ ہنسا۔ اُس کی ہنسی بڑی بھیانک تھی "اس بنگلے ماں کوئی بابو رات نہیں گُجار سکے ہے" وہ بولا۔

"تُو جو رہتا ہے، یہاں۔"

"میری اور بات ہے" وہ بولا "دیکھ، بابو۔ میری طرح سے نہ نہیں۔ بے سک یہاں کھاٹ پر پڑا رہ، میرے ساتھ۔ پر جو آدھی رات کے بخت تجھے کچھ ہو گیا تو میری جمّے داری نہیں ہوگی۔"

"نہیں، تیری ذمّے داری نہیں ہوگی۔ تیری تو مہربانی ہوگی" میں نے کہا۔

"اور جو آدھی رات کے بخت تجھے ہسپتال لے جانا پڑا تو ———؟"

"نہیں، نہیں۔ تُو فکر نہ کر فضلُو۔"

"بڑا دل گُردے والا ہے، تُو بھی۔ بیٹھ جا کھاٹ پر۔ کیا یُونہی کھڑا رہے گا، رات بھر؟"

بات بن گئی، میں نے سوچا۔ میری سکیم چل گئی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"اِک بات پُوچھوں، فضلو؟" میں نے کہا۔

"پُوچھ" وہ بولا "اِک کیا دو پُوچھ۔"

"یہاں رات کو ہوتا کیا ہے ؟"

"ہوتا تو کچھ بھی نہیں" وہ بولا "بس وہ بڈّھا ساری رات بنگلے ماں گھومتا پھرتا رہے ہے۔ کدی بگیچے ماں کدی برسادے ماں۔ کدی اِدھر کدی اُدھر۔ کمروں کے دروجے بجاوے ہے۔ آواجیں دے ہے۔"

"کسے آوازیں دے ہے ؟"

"پتا نہیں، کسے دے ہے آواجیں۔ کدی کدی اپنے گھروالی کا ناؤں لے ہے۔ بھاطمہ بھاطمہ کرے ہے۔"

"تجھے پتا ہے، یہ بڈّھا کون ہے ؟"

"ہاں" وہ بولا "علی ہے۔ اس گھر کا مالک، علی احمد، جس کے ناؤں پر یہ بنگلا ہے۔"

"اور وہ کہتا کیا ہے ؟" میں نے پُوچھا۔

"پتا نہیں، کیا کہتا ہے" وہ بولا "پر جو کچھ بھی وہ کہے ہے، وہ سُنا نہیں جاوے ہے۔ سہانا نہیں جاوے ہے۔ بڑا بڑا دل گُردے والا بھی ہمت ہار دیوے ہے۔ اُٹھ کر بھاگ لے ہے۔"

"مطلب ہے کہ اس کے لفظ سمجھ میں نہیں آتے ؟"

"نہیں، نہیں" وہ بولا "لبھج تو سمجھ میں آ دیں ہیں۔ پر یو سمجھ ماں نہیں آوے ہے کہ وہ کہتا کیا ہے۔ رُک رُک کر بولے ہے۔ پہلے تو کچھ پُوچھے ہے۔ پتا نہیں کیا پُوچھے ہے۔ اُونچی آواج ہیں پُوچھے ہے۔ پُوچھتا جائے ہے۔ پُوچھتا جائے ہے۔ پوچھتا جائے ہے۔ ساتھ گھومتا پھرتا رہے ہے۔ ابھی آواج اِدھر سے آئی، پھر اُدھر سے آ رہی ہے۔ پھر بڑا کمرا جو ہے نا، اس میں گُونجی۔ پھر اُوپر ٹیرس سے بول رہا ہے۔ انا کسی سے بول رہا ہے۔ پوچھ رہا ہے۔ پُوچھے جا رہا ہے۔ پوچھے جا رہا ہے۔ پتا نہیں کیا پُوچھتا ہے۔ بس ایک لبھج بولے جائے ہے : کس لیے ؟ کس لیے ؟ کس لیے، بھاطمہ کس لیے ؟ یُوں

جیسے سوئی رکاٹ پہ اٹک جائے ہے۔ کدی اِدھر سے آواج آئے ہے، کدی اُدھر سے آواج آنے ہے۔ کدی بگیچے سے، کدی بڑے کمرے سے۔ کدی ٹریس سے، کدی انا کسی سے۔ چاروں طرپھ سے آواجیں آئیں ہیں۔ سارا گھر "کس لیے" کی آواجوں سے بھر جائے ہے۔

"پھر چُپ کا تمبُو تن جائے ہے۔ اتنی ڈونگی چُپ کہ گھر کھوہ بن جائے ہے۔ اور پھر وہ اس کھوہ میں سے بولے ہے : کیا اس لیے پھاطمہ؟ کیا اس لیے؟ جد وہ یہ کہے ہے تو دے سُنا نہیں جائے ہے۔ سہارا نہیں جائے ہے۔ ساری دُنیا کا دُکھ اس کی آواج میں سمو جائے ہے۔ جیسے جرب لگنے پہ انڈا پھوٹ گیا ہو۔ چینڑی چینڑی ہو گیا ہو۔ جیسے آنکھ پھوٹ کر آنسو بن گئی ہو۔ جیسے موٹر کا سیسہ چوٹ لگنے پر جرّوں کا ڈھیر بن جاوے ہے۔ جیسے دل چلتا چلتا رُک جاوے، جان نچڑ جاوے، لوتھڑا رہ جائے۔

"پھر بنگلے پہ موت چھا جاوے ہے۔ کالی بولی موت کچھ ملٹ تک سب نفی ہو جاوے ہے۔ جھینگر بولنا بند کر دیویں ہیں۔ بیٹری گونگی ہو جاوے ہے۔ گلی کے کُتّے سُن ہو جاویں ہیں۔ اس آواج کو سُن کر، اس ٹوٹ کو سُن کر سُدھ بُدھ ماری جاوے ہے۔"

میں خوف کے مارے کانپنے لگا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہنسا۔ "ابی نہیں بابو، ابی نہیں۔ ابی سے کیوں ڈرے رہے؟ وہ تو آدھی رات کے بکھت آوے ہے، یہاں بنگلے ماں۔"

"ہاں، میں ڈرتا ہوں۔" میں نے کہا "تو میری بات چھوڑ۔ یہ بتا پھر وہ بڈھا کیا کرتا ہے؟"

وہ ہنسا "پھر وہ پھر سے پُوچھنے لگے ہے : کس لیے، پھاطمہ، کس لیے؟ اور وہ چکّر پھر سے چل پڑے ہے۔ ساری رات یو چکّر چلتا رہے ہے۔ یونہی چلتا رہے ہے۔ تُو اسے نہیں سہار سکے گا، بابو۔ کوئی بھی نہیں سہار سکے ہے۔ دل پہ بوجھ پڑ جاوے ہے۔ نسیں دھنکی کی طرحیوں بجیں ہیں۔"

"تُو کیسے سہارے ہے، فضلو؟"

"ماں نے بس چاہ ایک دنا سہارا تھا، پہلے پہل۔ اب تو ماں افیم کی گولی کھا کر

پڑا رہوں ہوں۔ تو بھی کھا لے ایک، آج کی رات۔"

"یہ بتا، فضلو، کہ صرف بڈھے کی آوازیں آئیں ہیں یا کچھ نظر بھی آئے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تو پوچھے ہے بجز بھی پڑے ہے کچھ۔ کبھی میرے سرہانے آکر کھڑا رہے ہے۔ یہ سامنے پلاٹ میں گھومتا نجر آئے ہے۔ سارے گھر ماں گھومتا دسے ہے۔ وہی کالی میلی اچکن، وہی سیدھا پجامہ۔ ہاتھ ماں سوٹی۔ سر پر ٹوپی۔"

"تو نے اُسے جیتے جی بھی دیکھا، کبھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولا "صرف ایک بار۔ پر اس وخت مجھے بتا نہ تھا کہ یہ علی ہے۔ تیری طرح آیا تھا وہ، میرے پاس، رات گجارنے کے لیے۔ دیکھ نا، بابو۔ وہ تو بیس سال سے اُدھر کویت ماں بیٹھا تھا۔ دھڑا دھڑ کمائے جا رہا اور پیسہ گھر بھیجے جا رہا تھا۔ یہاں گھر ماں تو اس کی دو لڑخیاں، ایک لڑخا، ان کی ماں اور نوکر رہیں تھے۔ ہم تین نوکر تھے۔ برچی تھا، ایک لڑخا تھا اور میں تھا۔

"جس رات وہ آکر تیرے پاس رہا تھا، اُس نے تجھے کچھ بتایا تھا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں۔ سب کچھ بتایا تھا۔ بس یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ علی ہے۔ وہ تو ہمیں اگلے دنا پتا چلا جب اُس کی لاش ہسپتال سے آئی۔ ہوا یوں تھا کہ اس کی گھر والی پر دورہ پڑ گیا۔ ایک پاسا مارا گیا۔ جبان بند ہو گئی۔ وسے اُٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ اس کے چار چھ روج بعد وہ آیا۔ جس روج وہ آیا، اسی روج بڑی لڑخی کا جنم دن تھا۔ گھر ماں بڑی پالٹی تھی۔ بڑے انتجام تھے۔ پچیس مہانوں نے آنا تھا۔ ہم سب انتجاموں ماں لگے دسے تھے۔ جب وہ آیا تو وسے کسی نے نہ پوچھا کہ بھئی تو کون ہے۔ کسی نے نہ پچھانا۔ وسکے گھر والی یہاں تھی نہیں، جو پچھانتی۔ جب وس نے اپنے لڑخے اور لڑخیوں کو دیکھا تو وہ طور بطور ا گیا۔ ماں جانوں وس کے دل کو دھکا لگ گیا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پُچھا۔

"وہ تینوں ولیتی سکولوں کے پڑھے وے سن۔ سر پر بالوں کے یہ بڑے بڑے گھونسلے رکھے وے تھے۔ مُنھ پر رنگ روگن تھے۔ نیچے جانگیہ گھگھرے۔ باہیں بھی ننگی، ٹانگیں بھی ننگی۔ پتا ہی نہیں چلے تھا کہ کون لڑکا ہے کون لڑکی ہے۔ جد وہ میرے پاس آیا تھا تو گھبرایا وا تھا۔ میں نے وسے کہا تُو ابی سے گھبراگیا۔ ابی تو دیکھنا۔ جد پالٹی ہوگی تد دیکھنا۔ کیا کیا مخلوق آتی ہے یہاں، پالٹی ماں۔ ایسے ایسے حُلیے جو تُو نے کدی دیکھے نہ ہوں۔ ایسا ایسا پہناوا کہ توبہ ہے۔ اور پھر جد ٹیپ بجے گا۔ ایسے ایسے انگریجی گیت جو تُو نے کدی سُنے نہ ہوں۔ گیت کم کم چیکھیں جیادہ۔ پھر ہونکن، لیجت سے دم رُکنے والی ہونکن۔ دوجے کا دم روک دینے والی۔ پھر ناچ ہوگا۔ پاگلوں کا ناچ ——۔ پتا نہیں یہ سیٹھ لوک اپنے بچّوں کو انگریجی تلیم دے کر کیسی کیسی مخلوک پیدا کر دیتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا: وہ ہمارا سیٹھ علی جو ہے، دھڑا دھڑ پیسے بھیج رہا ہے کویت سے اندھا دُھند۔ کس لیے؟ کیا اس لیے کہ یہ مخلوک بنائے؟"

"تُو علی کو جانتا ہے؟" وس نے مجھ سے پُوچھا۔

میں نے کہا "نہیں۔ وہ کدی آیا بھی ہو گھر ماں۔"

"میں وسے جانتا ہُوں" اُس نے کہا۔ یہ کہ کر وہ کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ بولا "وہ اپنے لیے پیسے کمانے نہیں گیا وہاں کویت میں۔ یہاں وہ راج کا کام کرے تھا۔ ارمان سے دو وخت کی روٹی کھا وے تھا۔ بس ایک تکلیف تھی وسے۔ اہلکار اسے بے گار پر لے جاویں تھے۔ اس کی بے عجتی کریں تھے۔ ایک بار تو تھانے دار نے بے وزہ اسے حوالات میں بند کر دیا تھا۔ بس اُس روج سے اسے ایک لگن لگ گئی کہ باہر جاؤں، کمائی کروں، اپنے بچّوں کو اُونچی تلیم دوں، ولیتی سکولوں ماں پڑھاؤں تاکہ بڑے ہو کر وہ بڑے لوک بنیں اور کوئی ان کی بے عجتی نہ کر سکے۔ ان سے بیگار نہ لے سکے۔ انھیں بے وزہ حوالات میں نہ ڈال سکے۔ اس لیے وہ باہر چلا گیا، کویت ماں۔ اپنے لیے نہیں، اپنے بچّوں کی تلیم کے لیے۔

"آج بیس سال ہو گئے کہ وہ وطن سے باہر بیٹھا ہے۔ دن رات، دن رات اس کا ایک کام ہے۔ مسالا لگاتا ہے، اینٹ پر اینٹ رکھتا ہے اور اسے ٹھونکتا ہے۔ پھر مسالا لگاتا ہے۔ اینٹ پر اینٹ رکھتا ہے۔ اینٹ پر اینٹ رکھے جاتا ہے۔ دن رات اوور ٹیم کرتا ہے۔ اوور ٹیم کی کھاتر وہ گھر بھی نہیں آیا کرتی۔ ساری جندگانی اس نے بچوں کی تلیم کے لیے قربان کر دی۔"

عین اس وقت باغیچے سے آواز آئی:

"کس لیے؟ کس لیے؟ کس لیے، فاطمہ، کس لیے؟"

"لے!" فضلو بولا "لے بابو۔ وہ آ گیا۔ آدھی رات ہو گئی نا اور وہ آ گیا۔"

کس لیے؟ کس لیے؟ بنگلے کا کونا کونا اس کی آواز سے گونجنے لگا۔ وہ آواز بڑی خوفناک تھی۔ اسے سن کر جسم کے بال کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ آواز عام گلے سے نہیں نکل رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے آدھا گلا کٹا ہوا ہو۔ آدھے سے آواز نکل رہی ہو۔ جیسے بکرے کی شہ رگ کٹنے پر نکلتی ہے۔

وہ آواز سن کر میں سن ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی۔ دل پر منوں بوجھ پڑ گیا۔ سارے جسم میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ میں نے لپک کر بیگ اٹھایا اور دروازے کی طرف جست لگائی۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ میرے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہو۔ کس لیے؟ کس لیے؟ مجھ سے پوچھ رہا ہو۔ کس لیے، امتیاز کس لیے؟

جب میں گلی کے نکڑ پر پہنچا تو وہ آواز چھن سے ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ گئی۔ کیا اس لیے؟ پھر ایک خوفناک خاموشی چھا گئی جیسے سارا محلہ اندھے کنویں میں ڈوب گیا ہو۔

اندھا فُٹ پاتھیا

سڑک کے کنارے سُوکھے ہُوئے ٹنڈ منڈ درخت کا سہارا لیے، وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہے۔ ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ آنکھوں پر بڑے بڑے کالے شیشوں والی عینک لگی ہے۔ سامنے سڑک پر دھاری دار زیبرا گلی بنی ہُوئی ہے۔

وہ یہاں سالہا سال سے کھڑا ہے۔ کب سے کھڑا ہے؟ یاد نہیں۔ لگتا ہے، صدیاں بیت گئیں۔ شاید وہ بھُول چکا ہے کہ کیوں یہاں کھڑا ہے۔ شاید وہ سمجھنے لگا ہے کہ یہی اس کی منزل ہے۔ فُٹ پاتھ پر کھڑے رہنا۔ کھڑے کھڑے پتھرا جانا۔

کبھی کبھی اس کے ذہن میں دُھندلی دُھندلی یادیں اُبھرتی ہیں۔ دل سے نحیف سی آواز اُٹھتی ہے۔ نہیں نہیں۔ یہ میری منزل نہیں۔ میں تو یہاں اس لیے کھڑا ہُوا تھا کہ کوئی اللہ کا پیارا میری ڈنگوری پکڑ کر یہ خونیں سڑک پار کرا دے۔ اس سڑک کے پار جو ہرا بھرا باغیچہ ہے، وہاں پہنچا دے۔

یہ کالی لولی سڑک کتنی خوفناک ہے، جہاں تہ در تہ اندھیرایں جھُولتا جھومتا ہے جیسے کسی مہاراج کا ہاتھی بدمست ہو کر باہر نکل آیا ہو۔ سڑک پر یہاں وہاں منافقت کی بتّیاں ٹمٹما رہی ہیں، جو اندھیرے کو اور بھی دم گھُٹ بنا رہی ہیں۔

سڑک پر آوازوں کا ایک طوفان بہے جا رہا ہے۔ میں میں میں کی ایک مسلسل بھنبھناہٹ جیسے کھّیوں کے چھتّے چھڑے ہُوئے ہوں۔ خود ستائی کے اس پس منظر پر در پردہ دھمکیاں، دھونسیں، خبرداری زیر لبیاں، جھُوٹے دعوے، نمائشی وعدے۔

کُتّوں کی طرح بھونکتی ہُوئی گاڑیاں۔ پٹاخے چھوڑتے ہُوئے، سانپ کی طرح بل کھاتے ہُوئے،

جھولتے جھومتے ہوئے موٹر سائیکل۔ ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ چیختے ہوئے بدمست نوجوان سوار۔
دھوئیں کے مرغولے اڑاتی ہوئی ویگنیں۔

ہر چند لمحوں کے بعد آئی، آئی، آئی چیختی ہوئی ایک گاڑی دوسری پر چڑھ جاتی ہے۔
دھڑا دھڑا دوم ٹکر کی آواز فضا میں گونجتی ہے۔ ملبے کا ایک انار ہوا میں چھوٹتا ہے۔ ایک چیخ، ایک
کراہ۔ پھر کوڑے کا ایک ڈھیر آگرتا ہے اور کمیٹی کا بل ڈوزر اسے کنارے لگا دیتا ہے۔

پہیوں پر سوار، رفتار کے نشے میں چور، سڑک پر چلنے والے سنتے ہیں، مگر سنتے نہیں۔
دیکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ وہ اپنی ہی دھن میں مگن چلے جاتے ہیں۔ اور تیز، اور تیز۔ سود بٹ؟
پہیئے "میں" کی ہوا سے کچھ اور پھول جاتے ہیں۔ انا کی شوراشوری کی تانیں کچھ اور چڑھ جاتی ہیں۔ سڑک
کا اژدہا جھولتا ہے، جھومتا ہے۔ منافقت کی بتیاں آنکھیں مارتی ہیں۔ ہارن قہقہے لگاتے ہیں۔
سڑک شرابی کی طرح لڑکھڑاتے چلی جاتی ہے۔ اور وہ ـــــ وہ چپ چاپ سوکھے ہوئے
ٹنڈ منڈ درخت کا سہارا لیے کھڑا ہے۔

جب وہ نیا نیا فٹ پاتھ پر آکر کھڑا ہوا تھا، اس وقت کتنا پُر امید تھا۔ ہر آہٹ پر کان
کھڑے ہو جاتے تھے۔ سنو سنو، اس کے پاؤں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ وہ آ رہا ہے۔ آ رہا ہے۔
وہی ہے، وہی جو میری ڈنگوری پکڑ کر مجھے منزل تک لے جائے گا۔ وہی جس کے انتظار میں میں یہاں
کھڑا ہوں۔

پاؤں کی چاپ قریب آ رہی ہے، اور قریب، اور قریب۔ اس کی روح سمٹ کر کان بن
جاتی ہے۔ جسم کا ذرہ ذرہ خیر مقدم کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ ہیں! پاؤں کی چاپ تو رکے بغیر گزر گئی۔
مدہم اور مدہم۔ پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ بھیانک خاموشی۔ لمبی خاموشی۔

پاؤں کی چاپ پھر رک جاتی ہے۔

ہیں! وہ ٹھٹھکتا ہے۔

امید کا دیا پھر روشن ہو جاتا ہے۔

یہی ہے۔ یہی وہ راہبر ہے۔ پاؤں کی چاپ کہے دیتی ہے۔ یہی وہ راستہ دکھانے والا ہے۔ بسم اللہ آؤ، آؤ۔ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ نااُمیدی مجھے پتھرائے جا رہی تھی۔ مجھے پتھر ہونے سے بچا لو۔ آؤ آؤ۔

پاؤں کی چاپ پھر رُک جاتی ہے۔

اس کے چہرے پہ کرب کروٹیں لینے لگتا ہے۔

کیا مجھے راستہ دکھانے کے لیے کوئی نہیں آئے گا؟ کیا یہاں کوئی راہبر نہیں؟ کوئی نہیں جو آ کر کہے بابا، آ میں تجھے پار لنگھا دوں ــــ کوئی نہیں آتا۔ کوئی نہیں۔ ویسے آوازیں آتی ہیں۔ کب سے آ رہی ہیں۔ مسلسل خالی خولی آوازیں۔ مُنھ زبانی آوازیں۔

پتا نہیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ فٹ پاتھ سے، سڑک سے یا کمیٹی گھر سے۔ صاف آوازیں، بلند آوازیں، جیسے لاؤڈ سپیکروں سے آ رہی ہوں۔ بھانت بھانت کی آوازیں۔ انداز مختلف ہیں۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔

ایک کہتی ہے: ٹھہرو، میں آ رہا ہوں۔ میں تمھیں پار لگا دوں گا۔ میرا انتظار کرو۔

دُوسری اعلان کرتی ہے: میں تمھاری مشکل کو جانتا ہوں۔ میں تمھارے راستے کے کانٹے چنوں گا۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ میں اس جگہ کو گل و گلزار بنا دوں گا۔ میں میں۔

پھر ایک رقص کرتی ہوئی آواز آتی ہے: ادھر دیکھو۔ میرے ایک ہاتھ میں روٹی ہے۔ دُوسرے میں مکان ہے، کپڑا ہے۔ تمھاری تمام مشکلات حل ہو گئیں۔ سارے مسئلے طے ہو گئے۔ اب ذرا مجھے آ لینے دو۔ میرا انتظار کرو۔

پھر کوئی کھانستا ہے۔ کھانسی والا کھانسنا نہیں، خبردار کرنے والا کھانسنا۔ تم اللہ کے حکم کے پابند ہو۔ جب تک پابندی کی تکمیل نہیں ہوگی، کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں۔ تکمیلِ پابندی کی تفصیلات ہم سے پوچھو۔ اس راز کو ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ صرف ہم جانتے ہیں۔ صرف ہم۔ صرف ہم، ہم، ہم۔

ان آوازوں کو سن سن کر اس میں نئے خوف جاگ رہے ہیں۔ انوکھے خوف، جن سے

پہلے وہ واقف نہ تھا۔ پہلے اس پر خوف طاری تھا کہ شاید کوئی نہ آئے۔ اب اسے ڈر ہے کہ شاید کوئی آجائے۔ پہلے وہ سوچتا تھا کہ کوئی نہ آیا تو کیا ہوگا۔ اب اسے ڈر ہے کہ کوئی آگیا تو کیا ہوگا۔ پہلے مایوسی کے عالم میں وہ آسمان کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ آسمان کی نیلگوں روشنی کے پیچھے کوئی مسکراتا۔ اس کی مسکراہٹ سے امید کی کرنیں نکلتیں۔ اس کے دل میں حوصلہ پیدا ہوجاتا۔ لیکن اب —— اب وہ اُدھر نہیں دیکھتا۔ اسے اُوپر والے پر بھروسا نہیں رہا۔ اسے محسوس ہونے لگا ہے جیسے اُوپر والا خود مجبور ہو۔ لوگ اس کا نام برت رہے ہیں۔ اپنے مفاد کے لیے اسے استعمال کر رہے ہیں۔ اپنی شمعیں جلانے کے لیے اس کا چقماق رگڑ رہے ہیں۔ لوگوں کو ڈرانے کے لیے اس کی رعد کڑکا رہے ہیں۔ اور وہ چُپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ کیا وہ کچھ نہیں کرسکتا؟

ان شکوک پر وہ لاحول پڑھتا ہے۔ اس کا دل خوف سے ڈُوبنے لگتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ خُدا کے متعلق دل میں شکوک پیدا ہوں۔ خُدا تو اس کے دل میں رچا بسا ہے۔ اس کا ایمان ذہن کی پیداوار نہیں۔ اسے دلیل اور عقل سے کوئی تعلق نہیں۔ شکوک اس کے ایمان کو ڈھنڈلا نہیں سکتے۔ وہ ایک عجیب مخمصے میں پڑا ہے۔ نہیں، نہیں۔ میرا قصور نہیں۔ یہ شبہات گرد و پیش کی دین ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے! فٹ پاتھ سے ایک زیرلبی اُٹھتی ہے۔ یہ سب کمیٹی والوں کا قصور ہے۔ سڑک از خود خونیں نہیں۔ اسے خونیں بنایا جا رہا ہے۔ حرکت کو شہ دی جارہی ہے تاکہ قیام کے سکون کے تحت حقیقت کا راز کھل نہ جائے۔ رفتار کے بُل ڈاگ کو التزاماً کھلا چھوڑ رکھا ہے تاکہ اضطراب کا گرداب چلتا رہے۔ یہ میں ہیں کا جنگل خود نہیں اُگا۔ اسے اُگایا گیا ہے۔ سینچا جا رہا ہے۔ یہ سب اس لیے عمل میں لایا جا رہا ہے کہ بڑوں کا یہی حکم ہے۔ سڑک کو خونی بناؤ، اور خونی اور خونی۔ تاکہ کوئی اسے عبور نہ کرسکے۔ اس انا کے جنگل کو اور گھنا کردو، اور گھنا تاکہ کسی کو راستہ نہ ملے۔ لوگ فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے پتھرا جائیں۔ اس ظلمت کے اندھیرے کو اور گاڑھا کردو، اور گاڑھا۔ جلتی بُجھتی منافقت کی بتیوں اور ٹمٹماؤ، اور ٹمٹماؤ۔ سب اندھے ہوجائیں۔ کوئی منزل کو نہ پاسکے۔ ان "ہم ہم" کو جو راستہ دکھانے کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں اور شہ دو تاکہ

لوگوں کا "راستے" پر سے ایمان اُٹھ جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

کمیٹی والے احکامات کی پیروی کر رہے ہیں، کیونکہ خود کمیٹی والوں کا مفاد اس سے وابستہ ہے۔ کمیٹی والوں کا صرف ایک مقصد ہے کہ بدنظمی قائم رہے، بڑھے۔ بدنظمی دُور ہو جائے تو نظم و نسق والوں کی اہمیت مٹی میں مل جائے گی۔ وہ اس بڑھتی ہُوئی ظلمت پر خوش ہیں۔ لیکن یہ ظلمت ان کی پھیلائی ہُوئی نہیں۔ وہ تو صرف اسے ہوا دیتے ہیں۔ یہ تو دساور سے آیا ہوا مال ہے۔ کسی نے امپورٹ نہیں کیا، صرف ایکسپورٹ کیا گیا ہے۔ انجن اُدھر چل رہا ہے، دھواں اِدھر نکل رہا ہے۔ مُرلی اُدھر بج رہی ہے، رادھا ادھر ناچ رہی ہے۔ پیر ڈپین اُدھر بین بجا رہا ہے، چوہے اِدھر پھُدک رہے ہیں۔ ڈوریاں وہاں بڑوں کے ہاتھوں میں ہیں، کٹ پتلیاں یہاں ناچ رہی ہیں۔

فُٹ پاتھ پر بھانت بھانت کی زیرِ لبیاں رواں دواں ہیں۔

فٹ پاتھ پر وہ اکیلا نہیں۔ ہزار لوگ آہٹ پر کان لگائے منتظر کھڑے ہیں۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کا انتظار ہے۔ کوئی فردِ واحد کا منتظر ہے، کوئی کسی جماعت کا۔

پھر وہاں پرچار یئے ہیں۔ افراد کے پرچار یئے، بڑوں کے پرچار یئے۔

ان پرچاریوں کی بھنبھناہٹ سے سارا فٹ پاتھ گویا مکھیوں کا چھتّا بنا ہُوا ہے۔ بھن بھن بھن مسلسل بھن بھن۔ باری باری وہ اس کے پاس آتے ہیں۔ کہتے ہیں: اندھے، خالی انتظار سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہم پر اعتماد کرو۔ ہمارے پیچھے آؤ۔ ہم جو دیکھ سکتے ہیں۔

افراد اور گروہوں کے مسلسل پرچار پر وہ زچ ہو گیا ہے۔ دفعتہً اس پر جلال طاری ہو جاتا ہے۔ ٹُنڈ مُنڈ درخت سے وہ اپنے سر کو اُٹھاتا ہے۔ آگے بڑھتا ہے۔ پھر رُک جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اپنی کالی عینک اُتارتا ہے۔ عینک کے نیچے سے دو آنسوؤں میں بھیگی ہُوئی روشن آنکھیں پرچاریوں کی طرف دیکھتی ہیں۔ "بھائیو، میں اندھا نہیں ہُوں" وہ آہ بھر کر کہتا ہے "میں نے ان آنکھوں سے اتنا کچھ دیکھا ہے کہ مزید دیکھنے کی ہمت نہیں رہی۔ اس لیے میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ وہ ایک لمبی آہ بھر کر دل سے زیرِ لبی کہتا ہے: کاش! میں اندھا ہوتا۔

کمرا نمبر ۱۷

ارجمند کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر سامنے بیٹھی ہوئی آویزہ کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھے جا رہا تھا۔

اس کے رُو برُو وہ آویزہ نہ تھی جسے وہ دفتر میں روز دیکھا کرتا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آویزہ اور لڑکی تھی، یہ آویزہ اور۔ دونوں میں کتنا فرق تھا۔

لیکن اس کے سامنے بیٹھی ہوئی وہی پُرانی آویزہ تھی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حسبِ معمول اس کے کٹے ہوئے بال ٹوکرا سے بکھرے ہوئے تھے اور اس بے ہنگم متوازی پھیلاؤ کے اندر ایک کیوٹ سا سہما ہوا چہرہ دبکا بیٹھا تھا۔

پہلے آویزہ کو دیکھ کر ارجمند کو غصہ آ جایا کرتا تھا، جسے وہ بمشکل ضبط کرتا تھا۔ آویزہ کو دیکھ کر اسے ایسے لگتا جیسے بالوں کا وہ پھیلاؤ ایک بہت بڑا جالا ہو، جسے بڑی محنت سے بُن کر مکڑا اس کے مرکز میں دبک کر بیٹھ گیا ہو کہ شکار پھنسے اور وہ جھپٹے۔ لیکن آج اُسے یُوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کالے بالوں کا وہ پھیلاؤ ایک بہت بڑی آنکھ ہو اور اس کے اندر وہ سجا بنا چمکدار چہرہ ایک اَن بہا آنسو ہو۔

ارجمند کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے بیٹھی ہوئی آویزہ کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھے جا رہا تھا۔

کتنی بڑی ذہنی کایا پلٹ تھی!

ایک چھوٹی سی بات نے اتنا فرق پیدا کر دیا تھا۔ دُنیا ہی بدل دی تھی۔ اور وہ چھوٹی سی

بات اس قدر معمولی تھی کہ ارجمند کو اس کے وقوع کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ اگر وہ کوئی حادثہ ہوتی یا سانحہ ہوتی یا ڈرامائی واقعہ ہوتی تو بھی اِک بات ہوتی۔ وہ تو ارجمند کی ہمشیرہ کے منھ سے نکلا ہوا ایک سرسری جملہ تھا: کیا فرق پڑتا ہے، بھائی جان۔

صبیحہ کے منھ سے بناؤ سنگار کے متعلق ایسی بات نکلے۔ صبیحہ جو بنی سجی گڑیا کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس جملے نے ارجمند کو چونکا کر رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر صبیحہ کی طرف دیکھا۔ صبیحہ کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ لباس کے رنگ مدھم پڑ گئے تھے۔ قمیص میں چسٹن نہ تھی۔ کلائیاں تیکھا پن کھو چکی تھیں۔ ناخن نیچرل ہو گئے تھے۔ لپ سٹک لاؤڈ نہ تھی۔ آنکھیں دکھنے والی نہیں بلکہ دیکھنے والی بن چکی تھیں۔ انداز مدھم تھا۔ آنکھوں سے مایوسی جھانک رہی تھی۔ ارجمند کے دل سے ایک آواز اٹھی: تو کیا وہ بن ٹھن ایک جد و جہد تھی؟ وہ اہتمام ایک ساتھی کی تلاش کے لیے تھا؟

ارجمند کو بھڑکیلے بناؤ سنگار سے سخت نفرت تھی۔

اس کے دفتر میں چار لڑکیاں کمپیوٹر ٹریننگ کے لیے بھرتی کی گئی تھیں: آویزہ، سنبل، ریٹا اور فاطمہ۔ جب وہ آئی تھیں تو دفتر میں رنگ و بو اور حرکات کا ایک طوفان آگیا تھا۔ بے شک دفتر میں ایک چہل پہل ہو گئی تھی۔ سٹاف کے فائلوں پر جھکے ہوئے لمبے لمبے چہرے گول ہو گئے تھے۔ چہروں کے ڈھلکے ہوئے خطوط اوپر اُبھر آئے تھے۔ دفتر روشن ہو گیا تھا۔ لیکن وہ ٹھہراؤ نہ رہا تھا۔ وہ سنجیدگی نہ رہی تھی۔ یوں جیسے کسی نے سوڈے میں چٹکی بھر نمک ڈال کر شوں کر دیا ہو۔ ارجمند اپنی برانچ کا انچارج تھا۔ دفتر میں رونق اور روشنی کی نسبت اس کی توجہ کام پر زیادہ مرکوز تھی۔ لہٰذا اسے لڑکیوں کی آمد اچھی نہ لگی تھی۔

بے شک لڑکیاں محنتی تھیں۔ توجہ اور شوق سے کام کرتی تھیں۔ لیکن انھوں نے تو فضا ہی بدل ڈالی تھی۔ اک ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ ٹھہرے پانی میں لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ سٹاف کی توجہ یوں بکھر گئی تھی جیسے تسبیح کا دھاگا ٹوٹ گیا ہو۔ اور پھر ان کا بناؤ سنگار کتنا لاؤڈ تھا۔ اس میں شدت تھی، تشدد تھا۔ ارجمند کو تو ایسے لگا تھا جیسے سکندر کی فوج کے چار جرنیلوں نے چڑھائی کر دی ہو۔

سُنبل نے شانوں پر سیاہ بال یوں بکھیر رکھے تھے، جیسے مشین گن اُٹھا رکھی ہو۔ اس کی موٹی موٹی کالی آنکھیں یُوں رول کرتی رہتی تھیں جیسے میدانِ جنگ میں ٹینک چل رہے ہوں۔

ریٹا پکّے کالے رنگ میں بلڈ رڈ ہونٹ نکالے پھرتی تھی۔ حالانکہ رسمی لحاظ سے خدو خال خاصے بدصورت تھے، لیکن اس نے خود پر لباس، حرکات اور میک اَپ کی ایسی پھول پتّیاں سجا رکھی تھیں کہ ہر کوئی مُنہ اُٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا۔ یوں ٹپ ٹپ کرکے چلتی کہ آواز سُن کر ہی سارا دفتر پسینے پسینے ہو جاتا۔ پاؤں کی آہٹ پر کان کھڑے ہو جاتے۔ جسم ایسے خم دپیچ کھاتا کہ خوبصورت اور بدصورت کا فرق مٹ جاتا۔ توجّہ کو برے کی طرح پھن اُٹھا کر کھڑی ہو جاتی، اور پھر اس کالی بین پر لہراتی۔ لہرائے جاتی۔

پھر وہ فاطمہ تھی۔ تھی تو گاؤں کی نو دولتی۔ دو بٹی کا کپڑا پہنتی —— لیکن کسی قدر توجّہ کی طالب تھی۔ بات بات پر شرما کر آنکھیں نیچی کر لیتی۔ مژگان کے چھپر کُھلتے بند ہوتے، پنکھا کرنے لگتے۔ چھاتیاں دھڑکتیں۔ گال اُبھر کر انار بن جاتے۔ بالوں کی لٹیں گرتیں، سنبھلتیں، پھر گر جاتیں۔ گویا اک طوفان آ جاتا۔

اور وہ آویزہ۔ ٹوکرا بالوں کے جالے تلے دبکا ہُوا مکھڑا کہ شکار پھنسے تو جھپٹے۔

سارا دفتر ان لڑکیوں کی زد میں آ گیا تھا۔ اس آندھی میں سبھی غبار سے اٹ گئے تھے دفتر کی وہ روانی اور سنجیدگی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ جھٹکے لگنے لگے تھے۔ ارجمند ان حالات کو دیکھ کر سٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ لیکن بے چارہ مجبور تھا۔ کیا کرتا۔

صرف دفتر کی بات نہ تھی۔ معاشرے پر مانگے کے فیشن کی یلغار سے وہ بیزار تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دورِ جدید نے ہر نوجوان لڑکی کو شدّت کا طمنچہ تھما رکھا ہے۔ ان میں جذبۂ تسخیر کا جنون پیدا کر رکھا ہے۔ بے مقصد، بے مرکز تفریحی تسخیر۔ کوئی بھی سامنے آئے، مھر ماڈ، چونکاڈ، نچاڈ، گراڈ۔

ارجمند کی نظر میں یہ چنگیزی فوج سڑکوں پر، بازاروں میں، باغوں میں، جگہ جگہ دندناتی پھرتی تھی۔ اور بے چارے مرد۔ سہمے سہمے ڈرے ڈرے گرولٹ ڈ اینیملز کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ خودنمائی

کا یہ جھگڑا کیوں چل رہا تھا؟ کیوں روز بروز بڑھتا جا رہا تھا؟ دھول اُڑا رہا تھا؟

اسے اپنی چھوٹی بہن صبیحہ کو دیکھ کر غصہ آیا کرتا تھا۔ اس قدر میڈاَپ۔ ارجمند کو بننے سنورنے پر اعتراض نہ تھا۔ وہ کہتا تھا: بے شک بنو سجو۔ لیکن اُچھلنے کا مطلب؟ چھینٹے اُڑانے کا مطلب؟ ہونٹوں کو بانس پر چڑھانے کا مطلب؟ بے شک آنکھوں کو کالا کر دو۔ بھوؤں کی کمان بناؤ۔ مژگان کا پنکھا چلاؤ۔ لیکن ہونٹوں کو خون آلود کر کے لوگوں کو کس بات کی دعوت دیتی ہو؟ اور وہ بھی یوں بر سرِ عام صلائے عام؟

ارجمند کے خیالات کے مطابق عورت ایک قابلِ عزت مخلوق تھی۔ وہ کائنات کی ماں تھی۔ ممتا کی رکھوالی تھی، جس کے جھولنے میں ساری مخلوقات پل کر جوان ہوئی تھیں۔ لیکن دورِ حاضرہ نے اس عظیم مخلوق کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ ایک بنی سجی گڑیا جس کا مقصد دُوسروں کو لُبھانا تھا۔ ان کے ہاتھ کا کھلونا بننا تھا۔ جو اپنے ہونٹوں پر شنگرفی رنگ سے ہاں لکھ کر اسے نشر کرتی پھرے۔ جو خود کھلونا بن کر دوسروں کو کھلاڑی بننے کی دعوت دیتی پھرے، وہ معاشرے میں عزت کی طالب کیسے ہو سکتی ہے۔

ارجمند کے یہ سارے خیالات صبیحہ کے منہ سے نکلے ہُوئے ایک جُملے نے صابون کے جھاگ کی طرح اُڑا دیے تھے۔ اس کی نگاہ میں گرد و پیش یکسر بدل گئے تھے۔ یہ کایا پلٹ صبیحہ کی زندگی سے گہری تعلق رکھتی تھی۔

جب صبیحہ کالج میں تعلیم پا رہی تھی تو دفعتاً اس میں نمود و نمائی کا طوفان جاگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس حد تک بڑھ گیا کہ کالج جاتی تو اسے معلوم پڑتا جیسے کالج نہیں، سٹیج پر جا رہی ہو۔ اس پر ارجمند کو بہت غصہ آتا۔ لیکن ماں باپ کی موجودگی میں وہ کیا کر سکتا تھا کسمسا کر رہ جاتا۔ اس کے باوجود اس نے ماں سے کئی بار کہا تھا کہ زیبائش کے جذبے کو اس قدر شہ نہیں دینی چاہیے کہ بناوٹ کے علاوہ اور کچھ رہے ہی نہیں۔

صبیحہ بھائی کی باتیں سُنتی۔ ناک بھوں چڑھاتی۔ ایک کان سے سُنتی دُوسرے

سے اُڑا دیتی۔

جوں جوں وہ درجے پاس کرتی گئی، سجاوٹ کا جنون بڑھتا ہی گیا۔ فیشن کی نئی نئی پھول پتیاں لگتی گئیں۔ بہن بھائی میں فاصلہ بڑھتا گیا۔

پہلے بال پھول بنے۔ پھر کھُل کر شانوں پر بکھر گئے۔ پھر کٹ گئے۔ جھاڑ فانوس کی شکل اختیار کر گئے۔ ناخن چھُریاں بن گئے۔ لپ سٹک کے رنگ گہرے ہوتے گئے۔ لاؤڈ۔ آنکھیں کشتیاں بن کر ڈولنے لگیں۔ یہاں تک کہ صبیحہ کے نام نے بھی کئی ایک کینچلیاں بدلیں۔ صبیحہ سے صبیح، پھر صبوحی، پھر صبّو۔ جسم بوتل کی شکل اختیار کر گیا۔ لباس جسم سے ایسا چمٹا کہ دونوں میں فرق نہ رہا۔ اُبھار تیکھے ہو گئے، گولائیاں نمایاں۔

انہی دنوں گھر میں صبیحہ کے رشتے کی بات چلی۔ زیرِ لبیاں اُبھریں۔ مشورے ہوئے۔ لڑکا ارجمند کے دفتر میں افسر تھا۔ ارجمند نے بہت کوشش کی کہ رشتہ ہو جائے۔ گھر والے سبھی حق میں تھے۔ لیکن صبیحہ نے اسے رد کر دیا۔ اُسے لڑکا پسند نہ تھا۔ کیونکہ وہ لڑکا نظر نہ آتا تھا۔ اس میں ٹھہراؤ تھا۔ سنجیدگی تھی۔ وہ معزز نظر آتا تھا۔ اگرچہ عمر زیادہ نہ تھی۔ اس پر ارجمند کو بہت غصہ آیا۔ بہرحال، بات ٹوٹ گئی۔ ایک سال گزر گیا۔

پھر جب صبیحہ آخری درجے میں تھی تو ایک اور سرگوشی اُبھری۔ سلمان۔ سلمان صبیحہ کا چناؤ تھا۔ گھر میں دبی آوازمیں سلمان کا ذکر ہونے لگا۔ پھر ایک روز سلمان گھر آ گیا۔ گھر کے لوگ باری باری اُسے دیکھنے لگے۔ کوئی اوٹ سے، کوئی درز سے، کوئی برملا۔

سلمان بالکل ہی لڑکا تھا، اس حد تک کہ شو بوائے نظر آتا تھا۔ دیکھنے میں گڈا۔ بنا سجا ہُوا گڈا۔ انداز سوفسٹیکیٹڈ۔ رویّہ ہُوکیبٹرز۔ نفاست ایسی جیسے سلمان نہیں، سلیمہ ہو۔ جاذبِ نظر ایسا جیسے ڈیکوریشن پیس ہو۔ صبیحہ نے ماں باپ پر بہت زور دیا کہ سلمان کے گھر پیغام لے جائیں، لیکن وہ ہچکچاتے رہے۔ پیغام تو لڑکی کے گھر آتا ہے۔ بہرحال، ارجمند نے شدّت سے مخالفت کی۔ اگرچہ کہا جاتا تھا کہ سلمان کا مستقبل درخشاں ہے، لیکن حال تو خاصا بے حال تھا۔ اس پر والدین نے ارجمند

کی بات مان لی، اور بات کھٹائی میں پڑ گئی۔ شاید بات پھر سے اُبھرتی لیکن جلد ہی سلمان کا ایک سکینڈل سامنے آ گیا۔ پتا چلا کہ وہ تو لیڈیز مین ہے۔

اس کے بعد صبیحہ کی سجاوٹ میں نئے نئے پیچ و خم شامل ہو گئے۔ صبیحہ اور چمکی، اور چمکی جیسے بجھنے سے پہلے دیا بھڑک کر جلتا ہے۔

تحصیلِ علم کرنے کے بعد لیکچرار کی حیثیت سے اس کی تعیناتی ہو گئی اور وہ ایک دُور دراز شہر میں چلی گئی۔

دو سال کے بعد جب وہ چھٹیوں پر گھر آئی تو ارجمند اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لپ سٹک مدھم پڑ چکی تھی۔ لباس کے رنگ ہلکے ہو چکے تھے۔ قمیص ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ بال بندھ گئے تھے۔ آنکھیں دکھنے والی نہ رہی تھیں۔ اور پھر سجاوٹ کے متعلق اُس کے مُنھ سے یہ جملہ سُن کر "کیا فرق پڑتا ہے، بھائی جان" وہ سُن ہو کر رہ گیا تھا۔

کیا وہ نا اُمید ہو چکی تھی، ہمیشہ کے لیے نا اُمید؟ کیا وہ بناؤ سنگار اُمید کی ایک صورت تھی؟ جیون ساتھی حاصل کرنے کے لیے ایک معصوم جدّ و جہد تھی؟

اس روز شام کو جب وہ بازار گیا تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ بنی بنی جوان لڑکیاں یوُں نظر آ رہی تھیں جیسے چراغِ سحری بجھنے سے پہلے بھڑک کر جل رہے ہوں۔ اُونچی ایڑیوں کی ٹپ ٹپ یوُں سُنائی دے رہی تھی جیسے کوچ کرنے کا نقارہ بج رہا ہو۔ اعضا کے پیچ و خم اور حرکات کی لے یوُں دکھائی دے رہی تھی جیسے محرومی سے بچنے کے لیے داؤ پیچ کھیلے جا رہے ہوں۔

اُس روز ارجمند نے شدّت سے محسوس کیا کہ رعنائیوں کی یہ نمائش دراصل بر تلاش کرنے کی جدّ و جہد ہے۔ تعلیم اور سٹیٹس نے لڑکیوں کے آئیڈیلز میں ہوا بھر دی تھی۔ غبارے اُڑنے لگے تھے۔ اور بلند اور بلند۔ توقعات نے اپنے گھونسلے اتنے بنا لیے تھے کہ زیادہ تر نوجوان بالشتیے نظر آنے لگے تھے۔ گھر والوں کی پسند سے چِڑ ہو گئی تھی۔ اپنی پسند فروعات سے اٹ گئی تھی۔ مواقع کم ہوتے جا رہے تھے۔ اور کم اور کم۔ ڈوبتے ہُوئے تنکوں کی طرف جھپٹ رہے تھے۔

اس رات ارجمند کو نیند نہ آئی۔ احساسِ گناہ کی چبھن بڑھتی گئی۔ بڑھتی گئی۔ اس کے دل سے آواز آ رہی تھی: صبیحہ کی محرومی کی ذمے داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ تم نے سلمان کے خلاف محاذ قائم کیا تھا۔ اب وہ عمر بھر محروم رہے گی۔ اکیلی۔ تنہا۔

اگلی صبح اس کی بیگم نے جھنجھوڑ کر اسے جگایا "اٹھیے نا۔ صبیحہ کب سے انتظار کر رہی ہے"۔

ارجمند کو یاد آیا کہ اس نے صبیحہ کے ساتھ لاہور جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ لاہور میں اسے ہیڈ آفس میں کام تھا۔ صبیحہ نے یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنی تھی۔

لاہور پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ صبیحہ فنکشن کے لیے لیٹ ہو گئی تھی۔ ارجمند نے ٹیکسی لی اور صبیحہ کو سیدھا یونیورسٹی لے گیا۔ اسے سمجھا دیا کہ فارغ ہو کر سیدھی ہوم ہوٹل میں آ جائے، جہاں وہ ٹھہریں گے۔ ہوٹل کے ریسپشنسٹ کے پاس وہ پیغام چھوڑ دے گا۔ کمرا نمبر بورڈ پر دیکھ لے۔

یونیورسٹی سے سیدھا ہوٹل پہنچا۔ کمرا نمبر ۱۶ بک کرایا۔ سامان رکھوایا۔ پھر برآمدے میں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ دفعتہً ملحقہ نمبر ۱۷ کا دروازہ کھلا۔ سلمان باہر نکلا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔

ارجمند نے بیرے سے پوچھا: کمرا نمبر سترہ میں کون ٹھہرے ہوئے ہیں؟

"سلمان صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں" اس نے جواب دیا "ابھی ابھی نیچے گئے ہیں"۔

صبیحہ نے شام پانچ بجے آنا تھا۔ ساڑھے چار کے قریب ارجمند اٹھا۔ تیاری کی۔ ایک کاغذ پر صبیحہ کے نام میسج لکھا "مجھے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ شاید میں رات کو لیٹ لوٹوں۔ گھبرانا نہیں"۔

اس نے کاغذ تہ کیا، لفافہ بند کیا، لفافے پر لکھا: میسج برائے صبیحہ۔ از ارجمند کمرا نمبر ۱۷۔

وہ نیچے اترا۔ ریسپشن کو لفافہ دیا۔ پھر بورڈ کی طرف بڑھا، جس پر کمروں کے نمبروں تلے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا کارڈ سولہ نمبر کے خانے سے نکال کر سترہ نمبر کے خانے میں فٹ کر دیا۔ پھر وہ عجلت سے ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے!

ماڈ ہاؤس

فردوس کالونی میں، فن کار روڈ پر، ایک بنگلا واقع ہے، فوارہ چوک کے نکڑ پر۔ اسے دیکھ کر حسّاس راہ گیر رُک جاتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی مسجد براق سی سفید چادر اوڑھے درختوں کی اوٹ میں بیٹھی ہو۔ خاموش، پُرسکون، بے نیاز۔

یوں لگتا ہے جیسے وہ بنگلا نروان حاصل کرنے کے لیے بنایا گیا ہو۔ باہر تختی پر ماڈ ہاؤس لکھا دیکھ کر آپ گھبرا جاتے ہیں۔ ماڈ تو حرکت ہے، اضطراب ہے، بے چینی ہے، زندگی ہے۔ اس بودھ کے ٹھپے کو ماڈ سے کیا تعلق۔

اندر بیک یارڈ میں ڈیڈی سوٹ پہنے، ٹائی لگائے، سٹف کالر سمیت راکنگ چیئر پر جھول رہے ہیں۔ ہاتھ میں پائپ ہے۔ گود میں ماچس ہے۔ بار بار پائپ سُلگاتے ہیں۔ وہ سلگتی ہے، بجھ جاتی ہے۔ پھر سلگتی ہے، پھر بجھ جاتی ہے۔ بیچاری جلتی بجھتی روشنی کی طرح ٹم ٹم کر رہی ہے۔ وہ خود بھی جلتی بجھتی بتی کی طرح ٹم ٹم کر رہے ہیں۔ چہرے پر کبھی سُرخ بتی جل جاتی ہے، کبھی سبز۔ ظاہر ہے کہ سوچوں میں پڑے ہیں۔ جسم بھی جھول رہا ہے، ذہن بھی۔

ممی اندر ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھی ہیں۔ سامنے بیسیوں شیشیاں، بوتلیں، قطار باندھے کھڑی ہیں۔ بے چاری بوتلیں کیا کریں۔ مقابلہ سخت ہے۔ مینوپاز سر پر آ کھڑا ہے۔ جسم ڈھلنے لگا ہے۔ وزن بڑھتا جا رہا ہے۔ چہرے کے مسام یوں پھیل گئے ہیں جیسے برسات میں گھاس پھوس پھیلتے ہیں۔ پھر بھی یہ بوتلیں اور شیشیاں حسبِ توفیق بازیابی کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔

ممی کا یہ شغل خاصا دائمی ہے۔ یا تو وہ گھر سے باہر رہتی ہیں، اور جب گھر میں ہوں تو ڈریسنگ ٹیبل

پر۔ ڈیڈی تو اس تفصیل کو عرصے سے نظر انداز کر چکے ہیں۔ کوئی یاد دلائے تو مسکرا دیتے ہیں اور زیرِ لب بوڑھی گھوڑی لال لگام کہ کر دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

بچے اس تفصیل کو معاف نہیں کر سکے۔ خصوصاً بڑی عمیرا ہے۔ اوّل تو ادھر دیکھے گی نہیں۔ اسے دیکھے بغیر پتا ہے کہ ممی کہاں بیٹھی ہیں۔ کیسے بیٹھی ہیں۔ عمیرا کو میک اپ سے بیر نہیں میک اپ کرو، بے شک کرو۔ ناؤ جب تک پانی میں ہے، اسے چلاؤ۔ جب وہ خشکی پہ آ چڑھے، پھر پتوار چلانے کا فائدہ؟ اسے ممی کے میک اپ پر یہی شکایت ہے کہ ممی ریت پہ تیرنے کی کوشش میں لگی ہیں۔ منجھلے عمران کو گھر کے سبھی لوگوں سے شکایت ہے۔ کوئی بھی اسے لفٹ نہیں دیتا۔ ہر کوئی خود میں کھویا ہوا ہے۔ ممی ویلفیئر کی دھن میں لگی ہیں۔ ہر وقت ویلفیئر کا جھنکنا جھنکاتی ہیں۔ آج یہاں میٹنگ ہے، کل وہاں سب کمیٹی ہے، پرسوں اُدھر فنکشن ہے۔

ڈیڈی بیک یارڈ میں راکنگ چیئر پر جھولتے رہتے ہیں۔ عمیرا ورکنگ وومن بنی پھرتی ہے۔ ٹپ ٹپ اُدھر جاتی ہے۔ ٹپ ٹپ اِدھر آتی ہے۔ کام کم، ٹپ ٹپ زیادہ۔ اسے سارے گھر پر غصہ ہے۔ یہ کیا گھر ہے! اونہوں! سیّاحوں کا اِن ہے۔ دن چڑھا اور سیاح جگہیں دیکھنے کے لیے نکلے۔ رات پڑی تو آ کر پڑ رہے۔ صرف چھوٹی آنسہ ہے جو سارا دن فون سے دل بہلاتی رہتی ہے۔

عمران کو ان حالات پر غصہ آتا ہے تو وہ اپنا موٹر سائیکل لے کر باہر نکل جاتا ہے۔ سائیلنسر پہلے ہی نکالا ہوا۔ اسی میل کی رفتار اور ساتھ غاؤں غاؤں۔ غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو گھر لوٹ آتا ہے۔ یار دوستوں کی منڈلی سے مل کر کوک پیتا ہے، برگر کھاتا ہے، ٹوہل پد دھوم۔

"ڈارلنگ" ڈیڈی نے آواز دی۔

ممی چونکیں۔ دیکھا نا، وہی بات ہوئی۔ مجھے پتا تھا کہ جب میرے آخری پچر رہ جائیں گے تو مجھے آواز دیں گے۔ انھیں پتا ہے کہ میں پہلے ہی پانچ منٹ لیٹ ہوں۔ بیگم شائستہ بخاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ یہ تو چاہتے ہی نہیں کہ میں اپنی کمٹمنٹس پوری کروں۔ جلتے ہیں نا، اس لیے "ڈارلنگ"۔ ڈیڈی نے پھر آواز دی۔ یہ کب سنے گی۔ اونہوں! جب لال لگام کسی ہو اس وقت نہیں سنتی۔

"ڈارلنگ" انھوں نے پھر آواز دی۔

"مجھے بُلایا ہے، جانی؟" ممی نے یوں مٹھاس چھلکائی جیسے شہد کی بوتل ہو۔

"اگر فرصت ہو تو میری ایک بات سن جانا" ڈیڈی بولے۔

"ہنہ! فرصت ہو۔ اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔" آ رہی ہوں، ڈارلنگ" ممی نے مسکراہٹ میں بھیگا بھیگا جواب دیا۔

بننا سنورنا ہی ختم نہیں ہوتا، آئیں گی کیسے، ڈیڈی نے سوچا۔ اس ڈریسنگ چیئر کو تو وکٹوریہ کراس ملنا چاہیے۔ بے چاری گھنٹوں اتنا بوجھ اُٹھاتی ہے۔ "ٹیک یور ٹائم ڈارلنگ" وہ باآواز بلند بولے۔

ڈیڈی کی آواز سُن کر عمیرا رُک جاتی ہے۔ وہ تو ٹہل رہی تھی۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر۔ اطمینان و آرام کی ٹہل نہیں۔ وہ ٹہل جو سکندرِ اعظم نے دریائے اٹک پار کرنے سے پہلے اپنے خیمے میں لگائی تھی۔ ایسی ٹہل گھر میں عام تھی۔ ہر کوئی کسی نہ کسی وقت لگاتا رہتا۔ کبھی ڈیڈی دفعتًا راکنگ چیئر سے اُٹھ بیٹھتے اور لان میں ٹہل لگانے لگتے۔ اس کی وجہ تو سبھی جانتے تھے۔ جب بھی گھر کے بجٹ کا دھارا چڑھ جاتا تو اسے عبور کرنے کے لیے وہ ٹہل لگاتے۔ ویسے چھوٹے موٹے مالی اُمور کو سُلجھانے کے لیے راکنگ چیئر کی ٹہل ہی کافی تھی۔ وہ بھی تو ایک ٹہل ہی تھی نا۔

عمران بے توجہی کے خلاف غصّے سے بھر جاتا تو ٹہل لگاتا، اور آخر موٹر سائیکل کی بھیجم دہاڑ اور راستی میل کی زد میں تسکین ڈھونڈتا۔

چھوٹی آنسہ بھی ٹہل لگاتی تھی۔ تنہائی اور اکیلے پن کے خلاف ٹہل۔ اسے یہ شکایت تھی کہ گھر میں کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ وہی روٹین۔ ممی کی مسلسل تیاری اور پھر روانگی۔ ڈیڈی کی مسلسل جلتی بجھتی پائپ اور پھر میٹنگ کانفرنس۔ سوشل کالز۔ باجی کی مسلسل ٹپ ٹپ اور پھر سہیلیوں کا جمگھٹ۔ وہ بے چاری دعائیں مانگتی: یا اللہ! کچھ ہو جائے۔ ایسا کچھ جو در و دیوار ہلا دے۔ پھر رات پڑتی، دن چڑھتا، پھر رات پڑ جاتی اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ پھر وہ مایوس ہو کر رانگ نمبر

ڈھونڈتی۔ اس کی نوٹ بک میں کئی ایک دلچسپ رانگ نمبر لکھے ہوئے تھے۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا کہ نوجوان اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے تھے۔ عمر رسیدہ باتوں کے تار باندھ دیتے۔ ایسے لچھے بن دیتے کہ ان سے نکلنے کو جی نہ چاہتا۔

گھر میں صرف امی تھی جس نے کبھی ٹہل نہ لگائی تھی۔ اسے ٹہل لگانے کی فرصت ہی نہ تھی۔ وہ تو گھر کی محور تھی۔ سارا گھر گرد گھومتا تھا۔ اگرچہ آفٹر نون باہر رہتی پھر بھی گھر اسی کی مرضی پر چلتا۔ حالات بگڑنے لگتے تو بچوں کو ڈانٹ دیتی اور میاں پر شہد کی بوتل کی پھوار چلا دیتی۔ چار چھ بار ایسے پیار سے ڈارلنگ کہتی کہ ڈیڈی کی پھٹکڑی پھل ہو کر رہ جاتی۔

ممی کی پرابلم تو ایک ہی تھی نا، ڈیڈی۔ وہ بھی صرف بجٹ کے حوالے سے۔ بجٹ چلتا رہے، ہنگامی خرچے پورے ہوتے رہیں۔ رہا میاں بیوی کا حوالہ، وہ تو شروع شروع میں زوروں پر ہوتا ہے۔ شروع شروع میں میاں کڑاہی کے چنے کی طرح تڑ تڑ کرتا ہے۔ جوں جوں عمر رسیدہ ہوتا جاتا ہے توں توں مدھم پڑتا جاتا ہے۔ بیوی ابھرتی جاتی ہے۔ ادھیڑ عمر میں دو چار سخت مقام آتے ہیں۔ جب میاں کی توجہ گھر سے باہر یہاں وہاں بھٹکتی ہے۔ لگتی ہے، ٹوٹتی ہے، پھر لگتی ہے۔ اگر بیوی اسے اہمیت نہ دے تو کشتی ڈانوا ڈول نہیں ہوتی۔ مہذب گھروں میں خالی میاں کی ہی نہیں، بیوی کی توجہ بھی بھٹکتی ہے۔ اس لیے گلے شکوے کی گنجائش نہیں رہتی۔ ڈوبنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

ممی یوں بھاگی بھاگی ڈیڈی کے پاس آئی جیسے فرمانبرداری کی ماری ہوئی ہو۔ "ساری ڈارلنگ" وہ بولی "ایک تو یہ سب کمیٹیاں جینے نہیں دیتیں۔ ویلفیئر تو جان کا دشمن ہو گیا۔ جی میں آتا ہے کہ استعفا دے دوں۔ کیوں ڈارلنگ، دے دوں؟"

ڈیڈی کو اچھی طرح پتا ہے کہ ویلفیئر کے پیڈسٹل پر بیگم کا بت کھڑا ہے۔ استعفا کون دیتا ہے۔ پھر بھی بیگم کا یہ کہنا کتنا خوش کن ہے۔ "بالکل نہ دینا" وہ جواب دیتا ہے "میں نے تو صرف اس لیے بلایا ہے کہ یاد دہانی کرا دوں۔ آج رات بیگم سہیل آئے گی۔"

اوہ! بیگم سہیل ــــــــــ وہ بج بج چمگادڑ۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ۔ میرے میاں کو توجہ دے کر بھرمائے بیٹھی ہے ـــــ "ہائے! بیگم سہیل" ممی نے شہد کی پھوار چلائی "میں تو کب سے ڈنر پر بلانا چاہ رہی ہوں۔ آج آئے گی۔ ویری نائس آف ہر۔ اچھا کیا جو مجھے بتا دیا۔ ڈونٹ وری ڈارلنگ"۔

عمیرا سُنتی ہے۔ ہئے! اتنا جھوٹ! ان دونوں نے کبھی آپس میں سچی بات بھی کی ہے۔ دونوں ہی جھوٹے ہیں۔ دونوں کو پتا ہے کہ مُنھ زبانی کے گلاب جامن تلتے ہیں۔

"بائی ڈارلنگ۔ میں شام سے پہلے آجاؤں گی۔ خدا حافظ"۔

عمیرا اطمینان کا سانس لیتی ہے۔ چلو، اچھا ہوا۔ اک رکاوٹ تو دُور ہوئی۔ شام تک سینو، نومی اور میں۔ ڈیڈی تو منتظر بیٹھے ہیں کہ کب ممی جائیں اور وہ سہیل کو فون کریں۔ بس فون کریں گے اور ان کے ہاں جا بیٹھیں گے۔ اس کے میاں سے شطرنج کی بازی رہے گی۔ بازی تو بس دکھاوا ہے۔ وہ ارد گرد گھومے گی۔ مسکرائے گی۔ یہ کھائیے۔ یہ آزمائیے۔ میری طرف دیکھیے۔

"بیٹے، عمران" ڈیڈی نے آواز دی۔

عمران چونکا۔ دی اولڈ مین از اَپ۔ پتا نہیں کیا کہے۔ کہاں بھیجے۔ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ اپنے کام سے واسطہ رکھتا ہے۔ بیٹا کہاں۔ مُنھ زبانی کا بیٹا ہوں۔

"سُنا نہیں؟ ڈیڈی بُلا رہے ہیں" آنسہ زیرِ لب بولی۔

"بڑی چہیتی آئی ہے، ڈیڈی کی" وہ غرّایا۔

"بیٹے، عمران" ڈیڈی نے پھر آواز دی۔

آ رہا ہوں، ڈیڈی ــــ "عمران اطمینان سے چلتا ہوا یوں پاس آ رُکا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو" جی ڈیڈی؟"

"فارغ ہو؟"

"جی، بالکل"۔

"ذرا سہیل صاحب کی طرف جانا۔"

اولڈ مین بالکل ہی لٹو ہو رہا ہے۔ "جی ڈیڈی"۔

"ان کا فون خراب ہے۔ کہنا ممی آج شام کو آپ کا انتظار کریں گی۔"

"جی، اچھا ــــ "ممی انتظار کریں گی۔ ممی ــــ ہُنہہ ــــ ابھی جاتا ہوں، جناب۔

عمران نے موٹر سائیکل سٹارٹ کیا۔ غصے سے ایکسیلیٹر کا گلا گھونٹا، اور زور سے، اور زور سے۔ گھر کی دیواریں لڑکھڑائیں۔ اور پھر غاؤں غاؤں۔

عمران کے جانے کے بعد ڈیڈی راکنگ چیئر سے اُٹھے۔ دو ایک منٹ باتھ روم میں سیٹی بجاتے رہے۔ پھر تیار ہو کر باہر نکل گئے۔

ڈیڈی کے جانے کے بعد عمیرا نے فون کیا "ہیلو، کون بول رہا ہے؟ ــــ اوہ یُو۔ گڈ ــــ کم اینڈ گٹ می۔"

فون کرنے کے بعد وہ پورٹیکو میں ٹپ ٹپ ٹہلنے لگی۔

عمیرا کے جانے کے بعد گھر شانت ہو گیا۔ جیسے کوئی مسجد براق سی سفید چادر اوڑھے درختوں کی اوٹ میں پُرسکون بیٹھی ہو۔

ایسے لگتا تھا جیسے وہ گھر نروان حاصل کرنے کے لیے بنایا گیا ہو۔

اندر ایک بھکشنی بیٹھی سوچ رہی تھی کہ نروان حاصل کرنے کے لیے میں کون سا رانگ نمبر گھماؤں!

سیڑھی سرکار

پتا نہیں، میں سیڑھی سرکار کیسے جا پہنچا۔

مجھ میں ایک اضطراب لہریں لے رہا تھا۔

ایسے لگتا تھا جیسے کوئی سوکھا پتا جھکڑ میں ڈول رہا ہو۔ نہیں۔ میں پتا نہیں تھا۔ میں تو خود جھکڑ تھا۔ منجدھار میں ناؤ نہیں تھا۔ خود منجدھار تھا۔ بیٹھتا تو لٹو کی طرح گھومتا۔ گھومے جاتا۔ چلتا تو شرابی کی طرح ڈولتا، لڑکھڑاتا، جھومتا۔

ایسی حالت میں اللہ نہ کرے کسی کو موٹر سائیکل میسر ہو۔ مجھے تھا، جو جلتی پر تیل چھڑکتا۔ اندر بھی گھاؤں گھاؤں، باہر بھی گھاؤں گھاؤں۔ اندر کا ایکسیلیٹر بھی کھلا، باہر کا بھی۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر غراتا پھرتا۔ بے معنی۔ بے مقصد۔ بے منزل۔

میں نے کئی بار سوچا تھا: الطاف، چھوڑ اس سائیکل کو کہیں پھینک آ۔ دُور بہت دُور۔ ورنہ ایک دن یہ سڑک پر لڈو بنا پڑا ہو گا، اور تیری لوبندی یہاں سے وہاں تک بکھری پڑی ہو گی۔

بس سوچتا رہا۔ کچھ کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ کیسے ہوتی؟ اندر چرخیاں چل رہی ہوں تو باہر گڑگڑاہٹ تو ہو گی۔

بظاہر اس اضطراب کی کوئی وجہ نہ تھی۔ میں آزاد تھا۔ مادر پدر آزاد۔ عیش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ پیسہ عام تھا۔ پیچھے جاگیر تھی۔ یونیورسٹی میں بڑی ٹیں تھی۔ لڑکے مانتے تھے۔ پروفیسر جانتے تھے۔ لڑکیاں تو بچھی ہوئی تھیں۔ دیکھتیں تو منھ سے رال ٹپکتی۔ بس ایک نگاہِ التفات

کی دیر تھی۔ پھر یہ اضطراب کیسا؟

نہیں۔ بے وجہ نہ تھا۔ اب جو میں سوچتا ہوں تو وجہ تھی۔ وہ بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ سامنے دھری تھی۔ لیکن میں اسے جاننا نہیں چاہتا تھا۔ ماننا نہیں چاہتا تھا۔ ماننا تو ٹھیس لگتی۔ آزاد منش بھلا اندر کی چھپی ہوئی زنجیروں کو کیسے مانے۔ ایمنسی پیشن کا دعوے دار اندر کی پھپھوندی کو کیسے مانے۔ دراصل میں ایک نہ تھا، دو تھا۔ باہر کچھ تھا، اندر کچھ اور تھا۔ دُور رہو جاؤ تو جھگڑ چلتا ہے۔ لٹو گھومتا ہے۔ سمت چھوٹ جاتی ہے۔ پھر بادیہ پیمائی، گھمن گھیری، زوں زوں، شوں شوں۔ ایک روز چلتے چلتے چونکا۔ رکا۔ جاگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سیڑھی سرکار کے گاؤں کی جانب جا رہا ہوں۔ کہاں شہر کی ریشمی سڑک کہاں کچا راستہ۔ خود کو روکا۔ یہ کیا کر رہا ہے احمق؟ سنی سُنائی پر اعتبار کر لیا؟ خود کا تماشا بنائے گا کیا؟

آٹھ دس دن کے بعد پھر وہی حادثہ ہوا۔ دیکھا کہ پھر سیڑھی سرکار کی طرف جا رہا ہوں۔ رُک گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دل میں "سو د ہاٹ" کی لہر اُٹھی۔ چلو، جو دل اُدھر جانے پر مچلا ہوا ہے تو ٹھیک ہے۔ کون سی قیامت آجائے گی۔

یہ سارا جھگڑا دراصل انطو کی وجہ سے تھا۔ اس کا نام انطونیا تھا۔ یونیورسٹی میں سبھی اسے انطو کہتے تھے۔ وہ رومانیہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا، کھڑا کا کھڑا رہ جاتا۔ پری نژاد نظر آتی تھی۔ کیسے نہ آتی نظر۔ بھئی، کوہ قاف کی جو تھی۔

پہلے روز تو میں بھی اسے دیکھ کر ٹھٹھکا۔ پھر میں نے سنبھالا دیا۔ اپنی میں کا بھید یہ تھا کہ لڑکیوں کو گھاس نہ ڈالو۔ وہ پیچھے پھریں، تم نہ پھرو۔ انطو کو دیکھا۔ پھر مُنھ موڑ لیا۔ آپ آئے گی سالی۔

اگرچہ دیر کے بعد آئی، مگر آئی۔ پھر ساتھ گھومنے پھرنے لگی۔ کیوں نہ پھرتی؟ دوسروں کے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ علانیہ ریشہ خطمی ہو جاتے۔ ہم اپنا کلف لگائے رکھتے تھے۔ کھڑ کھڑ کر کے بات کرتے۔

ایک روز بولی" یہ ہوسٹل تو گیلا کمبل ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا مطلب؟

بولی" ڈیمپ اینڈ ڈپیریسنگ۔"

میں نے کہا" وہ تو ہے۔ لڑکیاں لڑکے جُدا جُدا رہیں گے تو ڈیمپ اینڈ ڈپیریسنگ تو ہوگا۔"

بولی" جی چاہتا ہے شہر میں کوئی فلیٹ کرائے پر لے لوں۔"

میں نے کہا " لے لو۔"

بولی" کوئی ساتھی بھی تو ہو جو میرے ساتھ رہے۔"

میں نے کہا" مل جائے گا۔"

بولی" اتنا آزاد خیال کون ہوگا جو میرے ساتھ رہے؟"

میں نے کہا" ہم تمھاری پرابلم حل کر دیں گے۔"

بولی" وہ کیسے؟"

میں نے کہا" یہ خدمت میں سرانجام دے دوں؟"

بولی" یُو ڈونٹ مائنڈ اِٹ؟"

میں نے کہا" نو۔ ناٹ می۔"

بولی "اور دوسرا لوگ؟"

" ٹو ہل وِد دم" میں نے بے نیازی سے کہا۔

فلیٹ میں وہ اتنی اچھی ساتھی ثابت ہوئی۔ اتنی اچھی۔ اتنی قریب آگئی کہ روئیں روئیں میں بس گئی۔ تفریح سنجیدگی میں بدل گئی۔ بات دُور نکل گئی۔ لیکن اندر ہی اندر۔ باہر وہی کلف لگا رہا۔ بے نیازی کا روپ دھارے رکھا۔

پھر اور لوگ اسے ملنے فلیٹ میں آنے لگے۔

ایک روز بڑی معصومیت سے بولی "الطی، یُو مائنڈ اِٹ "

میں نے کہا "اونو۔ ناٹ می "

بولی " دیٹس گڈ۔ الطی، جسم تو اُوپر کی چیز ہے۔ سرسری تعلّق۔ اصل تعلق تو دل کا ہوتا ہے "

میں نے کہا " بالکل "

بولی " یُو ایگری ؟"

میں نے کہا " ٹوٹو "۔

جب اس نے پہلا سرسری تعلق پیدا کیا تو میرے دل پہ ایک کرنٹ لگا۔ میں نے دل کو سمجھایا بُجھایا : سالے، تفریح کو روگ بنا رہا ہے ؟ ہشت "

دُوسرا کرنٹ لگا تو میں ہشت کہنا بھی بھول گیا۔ پھر پہ بہ پہ لگے تو ساری آزاد خیالی بُلبلے بن گئی۔ اندر کا چور بھُوت بن کر باہر نکلا۔ اپٹی کیٹ دھری کی دھری رہ گئی۔ الطو کے کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا " الطو، سٹاپ دِس نانسنس "

وہ حیران " رئیلی الطو، یُو مائنڈ اِٹ۔ دیٹ مچ "

" یس، آئی ڈُو "

" آئی ام سو ساری، الطو۔ بٹ " وہ بٹ کا مفہوم بتائے بغیر رُک گئی۔

شام کو بٹ کا مفہوم واضح ہو گیا۔ وہ فلیٹ چھوڑ کر جا چُکی تھی۔ دو چار دن تو میں چوری چوری دل ہی دل میں انتظار کرتا رہا۔ پھر باہر والی "میں" جلال میں آگئی۔ میں خود کو ڈانٹنے لگا " احمق، یہ محبت تھوڑا ہی تھی۔ یہ تو ایک ارینجمنٹ تھا۔ تفریح تھی۔ چلی گئی ہے تو چلی جائے۔ اور آجائے گی۔ تفریح تو رنگا رنگ ہوتی ہے۔ یک رنگی تو بور یت ہوتی ہے۔ یہ تو سمجھ لو انٹرول ہے۔ تماشا پھر سے شروع ہو گا۔

لیکن وہ انٹرول جھکڑ بن گیا۔ لٹو گھومنے لگا۔ شرابی لڑکھڑانے لگا۔ موٹر سائیکل

نے جلتی پر تیل ڈالا۔ سمت چھوٹ گئی۔ پھر وہی بادیہ پیمائی۔

سارا جھگڑا دو ہونے کی وجہ سے تھا۔ ایک ہوتا تو دُکھ ہوتا۔ جھگڑا نہ ہوتا۔ دُکھ تھا، بہت گہرا۔ مگر میں اسے اپناتا نہ تھا۔ اس لیے جھگڑا چل رہا تھا۔

اس جھگڑے میں کئی ایک آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ کسی نے کہا: وہ کسی اور ساتھی کے ساتھ دوسرے فلیٹ میں چلی گئی ہے۔ ایک روز گھومتا پھرتا اُس فلیٹ تک جا پہنچا۔ ایک لمبی سی سیڑھی اُوپر تک چلی گئی تھی۔ اُوپر دروازہ تھا۔

پھر پتا نہیں کیا ہُوا۔ دن میں گھومتے پھرتے ہر دو تین گھنٹے کے بعد پھر سے وہی سیڑھی آجاتی۔ کبھی دائیں، کبھی بائیں۔ ساری رات سیڑھیاں چڑھتا رہتا۔ سارا دن سیڑھیوں کو دیکھ کر جی میں آتا کہ چڑھ جاؤں۔ چڑھ جاؤں تو سرسری تعلق صابون کے بلبلوں کی طرح اُڑ جائیں گے لیکن باہر کی "میں" ضد کیے بیٹھی رہی۔

چڑھ جاتا تو سیڑھی کے چکر میں نہ پڑتا۔ نہ چڑھا تو ایسا چکر چلا کہ میرے اِرد گرد چاروں طرف سیڑھیاں ہی سیڑھیاں کھڑی ہو گئیں۔

ایک روز بازار میں سیڑھی سرکار کی بات سُن کر کان کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھا، لوگ باگ میری بات کر رہے ہیں۔ حیران کہ انھیں کیسے پتا چلا کہ نیچے سیڑھی ہی سیڑھی، اُوپر سرکار ہی سرکار۔ بعد میں پتا چلا کہ کوئی اور سیڑھی سرکار ہیں جو عاشقوں کے پیر ہیں۔ اگرچہ میں نے یہ نہیں مانا تھا کہ یہ محبت کی گھمن گھیری ہے۔ پھر بھی دل میں چور تھا۔ اس لیے اَن جانے میں سیڑھی سرکار کی طرف رُخ کرتا رہا۔ اور بالآخر وہاں پہنچ گیا۔

سیڑھی سرکار دراصل شہر کا ایک مضاف ہے۔ چھوٹا سا ایک گاؤں، جس میں سیڑھی سرکار کا مزار ہے۔ مزار بہت فراخ ہے۔ باہر تین ملحقہ چبوترے ہیں، جن پر لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ عورتیں زیادہ ساتھ بچے۔ مرد کم کم۔ پہلے چبوترے پر جو مزار سے ملحق ہے تین ٹنڈ منڈ درخت ہیں۔ ان کی ٹہنیاں پتوں کی جگہ رنگ برنگی دھجیوں سے بھری ہوئی ہیں۔

ایسے لگتا ہے جیسے پتّوں کی جگہ دھجیاں اُگی ہُوئی ہوں۔ یہ دھجّیاں لوگوں کی آرزوئیں ہیں، تمنائیں ہیں، محبتیں ہیں، محرُومیاں ہیں۔ سب عشق کے بکھیڑے۔ محبُوب کی بے رُخی، بے وفائی، حالات کی ناسازگاری، ملاپ میں رکاوٹیں۔

سیڑھی سرکار عشق کا پیر ہے۔

درگاہ پہ جاؤ، مزار پہ سلام کرو، فاتحہ پڑھو، دعا مانگو: سرکار، میری محبّت کامیاب کردے۔ تیرے دربار پہ دیگ دوں گا۔ سیڑھی چڑھاؤں گا۔ پھر باہر آکر کپڑے کی رنگ دار کترن پر اپنا نام لکھو۔ اسے درخت پہ باندھو۔ پھر دعا پڑھو۔ منّت مانو۔

چبوترے پر چار دیواری کے ساتھ ساتھ سینکڑوں سیڑھیاں لگی کھڑی ہیں۔ میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا — یہ کیسا چڑھاوا ہے۔ پھر میرے سامنے فلیٹ کی سیڑھیاں آکھڑی ہوئیں۔ نیچے سیڑھیاں ہی سیڑھیاں۔ اُوپر سرکار۔ پتا نہیں کیوں میں سیڑھی سرکار سے مماثلت سی محسوس کر رہا تھا۔ دبیسے میں دو دِلا تھا۔ ایک دل چاہتا کہ مزار پہ جاؤں، دُعا مانگوں، کترن باندھوں، اور پھر فلیٹ کی سیڑھی چڑھ جاؤں۔ دُوسرا دِل ان ساری باتوں پر تمسخر سے ہنس رہا تھا۔

اس روز سے میرے دِل میں ایک لگن لگ گئی کہ سیڑھی سرکار کے بارے میں جانوں وہ کون تھے؟ کیا کرتے تھے؟ کہاں رہتے تھے؟ کیسے سیڑھی سرکار بنے؟ سیڑھی کی ان کی زندگی میں کیا اہمیت تھی؟

سارا دن میں شہر میں آوارہ گردی کرتا، گلیوں میں گھُومتا تاکہ سیڑھیاں نظر آئیں۔ مجھے سیڑھی آبسیشن ہو گیا تھا۔ رات کو سیڑھی سرکار پہنچتا اور لوگوں سے پُوچھتا پھرتا۔

وہاں سب لوگ سرکار کی کرامتوں سے بھرے پڑے تھے۔ کسی کو عِلم نہ تھا کہ سرکار کی زندگی کے کوائف کیا تھے۔ انھیں سیڑھی سرکار کیوں کہا جاتا تھا۔

پُوچھتے پُوچھتے ایک مست سے جا پُوچھا۔ وہ بولا "جا، نُوری کے پاس جا۔" اور پھر

گاؤں کے دُوسرے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مست سارا دن چار دیواری سے لگی ہُوئی سیڑھیوں سے جان بوجھ کر گرا کرتا تھا۔ پہلے چڑھ جاتا، پھر لُڑھکتا۔

نُوری بی بی نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ دیکھتی رہی۔ پھر بولی "تُو سرکار کی کہانی لکھنا چاہتا ہے؟ کیوں؟"

میں نے جھوٹ بول دیا۔ میں نے کہا" سرکار روز خواب میں آتے ہیں۔ کہتے ہیں: الطاف، اُٹھ، لکھ۔ ایک مہینا ہو گیا ہے۔ روز یہی ہوتا ہے۔ وہ میرے سرہانے کھڑے ہو کر اپنا کھونڈ کھڑکاتے ہیں: اُٹھ، لکھ۔"

وہ بہُت دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر بولی" اچھا، جو سرکار یہی چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ ویسے ان کی کہانی اس جوگی نہیں کہ سُنائی جائے۔ اور کہانی بھی کیا، بس نیچے وہ تھے، اُوپر تارا بائی تھی، اور درمیان میں چوبارے کی اُونچی لمبی سیڑھی تھی۔ پہلے دو سال وہ تارا بائی کے لیے چڑھتے رہے۔ پھر دو سال وہ تارا بائی کی سیڑھی سے گرتے رہے۔ پھر وہ اُوپر آ بیٹھے۔ تارا نیچے جا بیٹھی۔ پھر نہ تارا بائی رہی نہ وہ رہے۔ نہ میں رہا نہ تُو رہا۔ بس سیڑھی ہی سیڑھی رہ گئی۔ بس اتنی سی تو کہانی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

نُوری بی بی کی بات سُن کر میں بالکل ہی کنفیوزڈ ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے کہا" میں تو کچھ بھی نہیں سمجھا۔"

وہ مسکرائی۔ بولی" لڑکے، تُو جا۔ پہلے سیڑھی تو چڑھ۔ سیڑھی چڑھنا سیکھ۔ پھر میرے پاس آنا۔ ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔"

میں نے کہا" بی بی، میں تو دو ہُوں، ایک نہیں۔ دو دِلا سیڑھی کیسے چڑھے؟"

بولی" جب چڑھتے ہیں تو سبھی دو دِلے ہوتے ہیں۔ پھر گر گر کر ایک ہو جاتے ہیں۔ جب سرکار تارا بائی کی سیڑھیاں چڑھے تھے تو وہ بھی دو تھے۔ تارا بائی پر اتنے ریجھے کہ ساری جاگیر بیچ کر اسے کھلا دی۔ تارا بائی بھی تو کٹڑے کی رانی تھی۔ بڑے بڑے سیٹھ ہاتھ باندھے

کھڑے رہتے تھے۔ اس میں بلا کی بے نیازی تھی۔ سرکار بھی اس بے نیازی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ سب کچھ لٹا کر تارا کے در پہ جا بیٹھے۔ ہر چار ایک دِن کے بعد وہ تارا کو دیکھنے کے لیے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ چوبارے کی دہلیز پر پہنچتے تو بائی کے حواری انھیں دھکّے دے کر گرا دیتے۔ لڑکھڑاتے ہُوئے سیڑھیوں سے گرتے۔ ہڈیاں ٹوٹتیں۔ زخم آتے۔ نیل پڑ جاتے۔ کئی دِن زخموں کو سہلاتے رہتے۔ بدن میں پھر سے جان آتی تو پھر سیڑھیاں چڑھنے لگتے۔ پھر دھکّے کھا کر لُڑھکتے ہُوئے نیچے جا گرتے۔

کٹڑے کے دُکاندار بھاگے بھاگے آتے۔ سرکار کو اُٹھاتے۔ رُوئی سے زخم دھوتے۔ دوائیاں لگاتے۔ پٹّیاں باندھتے۔

ایک روز جب سرکار سیڑھیاں چڑھ کر چوبارے کی دہلیز پہ پہنچے تو اتّفاق سے تارا خود دروازے کے پاس کھڑی تھی۔

تارا نے بڑے ترس سے سرکار کی طرف دیکھا۔ سرکار ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہے۔

تارا بولی "بابا، کیوں خوامخواہ دھکّے کھاتے ہو۔ ہڈّیاں تڑواتے ہو۔ مجھے دیکھنا ہے تو دیکھ لو۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ جی بھر کر دیکھ لو۔"

سرکار نے کہا "تو کون ہے؟" یہ کہہ کر نُور بی بی چُپ ہو گئی۔

مُجھے یُوں لگا جیسے ساری کائنات چُپ ہو گئی ہو۔ صدیاں بیت گئیں۔ پھر اس نے سر اُٹھایا۔ بولی "بس اُس ایک جُملے نے تارا کو ریزہ ریزہ کر دیا۔"

ہوش آیا تو تارا اُن کی اُنگلی پکڑ کر اس گاؤں میں لے آئی۔ تارا کے سارے جسم پر نیل پڑے ہُوئے تھے۔ ہڈّیاں سُوجی ہُوئی تھیں۔ جگہ جگہ زخم تھے۔ سرکار دوا لگایا کرتے۔ زخم دھوتے۔ پٹّیاں باندھتے۔ لیکن جب بھی تارا ان سے بات کرتی تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے۔ پُوچھتے "تو کون ہے؟"

ایمان۔ اَپ، یَین، اَپ

دُور اُفق کے پاس غربُ الہند کے حسین جزیروں کے جُھرمٹ میں جھول جزیرہ اپنی آتش فشان خصلت کی وجہ سے جھول رہا تھا۔

جزیرے کے واحد باسی سُمرت اور سانورد اپنے محل منش گُنڈ میں بیٹھے تھے۔

سُمرت کا دھیان سانورد پر مرکوز تھا۔ اس کے دل میں محبت کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ سُمرت جذبے کی وجہ سے بند بند جھنجھنا رہی تھی۔ سارنگی کے تار چھڑے ہوئے تھے۔ تاروں کی لرزش سرتیوں سمرتیوں تک جا پہنچی تھی۔

پھر اتھاہ گہرائیوں میں کسی پُراسرار دف پر ضرب پڑی۔ گمک اُبھر کر سمرت کے سینے میں گونجی۔ دونوں پڑے دھاگے ترکٹ ناگے بجنے لگے۔ وہ گری جا رہی تھی۔ سانورد کا ہاتھ تھام لیا۔ مُلتجی پُراُمّید نگاہیں سانورد کا طواف کرنے لگیں۔

سانورد کو خبر ہی نہ تھی کہ سمرت جھولن میں ہے۔ بج رہی ہے۔

ویسے تو وہ سمرت کے پاس بیٹھا تھا لیکن پتا نہیں تھا کہاں۔ دُور کہیں آکاش پر بھٹک رہا تھا۔ سانورد کی بے خبری دیکھ کر سارنگی اُونچی سروں میں بین کرنے لگی۔ جوڑی نے توڑا مار کر سینہ پیٹ لیا۔

پھر سُمرت کے بھیتر شعلہ لپکا۔ کایا پلٹ ہوئی۔ استری ناری بن گئی۔

سُمرت اور سانورد دو ساتھی تھے۔ ازلی ساتھی۔

سُمرت سارنگی سمان تھی۔ تاریں ہی تاریں۔ لرزشیں ہی لرزشیں۔

سانورد مُرلی سمان تھا۔ ہوا ہی ہوا۔ چھید ہی چھید۔
سمرت بادِ نسیم تھی۔
سانورد بگولہ تھا۔
دونوں خوابوں کے متوالے تھے۔
سمرت سپنے دیکھتی تھی۔ حال کے سپنے۔
سانورد خواب دیکھتا تھا۔ فردا کے خواب۔
دونوں بھولن کے متوالے تھے۔
سمرت پریم جھولا تھی۔ سانورد زلزلہ۔

اس کے باوجود دونوں ساتھی تھے۔ جنم جنم کے ساتھی۔ ہاتھ میں ہاتھ دیے جزیرے میں گھومتے پھرتے۔ سمرت کے ہاتھ میں سانورد کا ہاتھ ہوتا۔ سمرت کی نگاہیں سانورد کا طواف کرتیں ـــــ سانورد کی نگاہیں آکاش کو گھورتیں۔

جزیرہ اس قدر حسین تھا کہ اگر وہ اس حُسنِ فراواں کو دیکھ پاتے تو تحیّر بڑھ کر انھیں تھام لیتا۔ پھر نہ جھولن رہتا نہ جزیرہ۔ لیکن وہ بھول جزیرے کے حُسن سے بیگانہ تھے۔

مانوسیّت نے سانورد کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس لیے جزیرہ اس کی نگاہوں میں ایک عام سا منظر تھا۔ سمرت کی آنکھوں کو پریم جھلمل نے دھندلا رکھا تھا۔ اس کے لیے جزیرہ حسین تو تھا لیکن صرف اِس لیے کہ وہاں سانورد تھا۔

سانورد کا ہونا سمرت کے لیے سب کچھ تھا۔ پھر بھی اس کا دل چاہتا کہ سانورد بھی جانے کہ سمرت ہے چاہے کہ سمرت ہو۔

اس وقت منش کُنڈ میں بیٹھے سمرت کے من میں یہ آرزو جاگی کہ سانورد جانے کہ سمرت ہے۔ چاہے کہ سمرت ہو۔ لیکن سانورد آکاش کے تاروں میں کھویا ہُوا تھا۔

آکاش کے تارے بڑ بڑ بھول جزیرے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دُوسرے کو

آنکھیں مار رہے تھے۔

جھول جزیرہ ہمیشہ سے ستاروں کی نگاہوں کا مرکز رہا تھا۔ جزیرہ کم کم، جھول زیادہ۔ اس لیے وہ اس کے باسیوں کو تکتے رہتے۔

ویسے تو دھرتی پر سینکڑوں جزیرے تھے، لیکن جھول جزیرہ سب سے زیادہ دلفریب تھا۔ ستارے دیکھ کر مسحور ہو جاتے۔ ان کا جی چاہتا کہ وہ آکاش کے بجائے جھول کے باسی ہوتے اور ہمیش پریم جھولنے میں پڑے جھولتے رہتے ـــــ لیکن انھیں یہ بھی پتا تھا کہ وہاں جانا تو ممکن ہے لیکن قیام کرنا ممکن نہیں۔ چونکہ وہاں رومانی فضاؤں کا تسلط ہے۔ چاروں طرف سے ایک لے ابھرتی ہے۔ ایک رقص بیدار ہوتا ہے۔ اور پھر ـــــ ایک مستی، ایک دیوانگی، ایک زلزلہ۔

پتا نہیں اس جزیرے کی تخلیق میں کیا حکمت کارفرما تھی۔ دیکھنے میں عام سا ٹاپو تھا۔ ایک بہت بڑا سبز پیالہ۔ پیالے کے وسط میں نیلی جھیل۔ جھیل کے عین بیچ میں سنہرے رنگ کی کھوکھلی چٹان آویزاں تھی جیسے کسی مندر کا کلس ہو۔ اس چٹان کی کھوہ میں منش کنڈ کا محل تھا جس میں سانوردا اور سمرت رہتے تھے۔

سبز پیالے کے اوپر چاروں طرف ناریل کے درخت استادہ تھے۔ درختوں کے پیچھے زمردی چٹانیں اور ان کے پیچھے نیلا سمندر۔

رات کے وقت منقش آسمان جھول کو یوں ڈھانپ لیتا جیسے دھانی طشت پر زرنگار سرپوش ڈال دیا گیا ہو۔ آکاش کے تارے جھول جزیرے کے باسیوں کے دیوانے تھے۔ وہ انھیں حیرت سے دیکھتے۔

"وہ دیکھو، وہ دیکھو،" ننھا تارا تالی بجا کر کہتا "وہ اپنے ڈرتے نینوں سے رنگ پچکاری چلا رہی ہے۔"

"ہاں،" دوسرا ہنستا "چلا رہی ہے، چلا رہی ہے۔ پر وہ بھیگتا نہیں۔"

"پتا نہیں کیا بھید ہے،" تیسرا گنگناتا۔

"وہ خود میں نہیں رہتی اور وہ خود میں قید پڑا ہے۔ پھر بھی وہ جنم جنم کے ساتھی ہیں" چوتھا ٹمٹماتا۔

"دیکھو، دیکھو،" ننھّا چلاّتا "کایا پلٹ ہو گئی۔ استری ناری بن گئی۔ اب ارد اور رت باہر نکلیں گے اور پھر ——"

"مت دیکھو۔ مت دیکھو۔" بڈّھا ستارہ ڈانٹتا "مت دیکھو۔ صرف وہی دیکھ سکتا ہے جو جانتا ہو۔ جو نہیں جانتا وہ دیکھے تو راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ دھیان لپٹ نہیں رہتا۔"

"ہونہہ! کیوں نہ دیکھیں،" ننھّا چلاّتا "جھول کے منظر کو دیکھ کر تو دیوتا خود اپنا کام کاج بھول جاتے ہیں۔"

"وہ دیکھو، وہ،" دوسرا چلاّ کر بولا "اندھی رت کھوہ سے باہر نکل آئی۔"

"ہاں،" تیسرے نے کہا "اس کا بدن یوں بل کھا رہا ہے جیسے آبنوسی گھمن گھیری ہو۔"

"سنو سنو۔ ارد چنگھاڑ رہا ہے۔ لو، گونگا ارد میدان میں آ پہنچا۔ اب اس میں اچھل جاگے گی، اور وہ سرو سمان ابھرے گا۔ پھر رت پر جھپٹے گا۔"

"اور پھر پریم ناچ" ننھّے نے تالی بجائی۔

"اونہوں۔ پریم ناچ نہیں، پُتر،" بوڑھا ستارہ بولا "یُدھ ناچ۔"

دیوتاؤں کو پتا چلتا کہ ستارے دیکھ رہے ہیں تو وہ جزیرے پر بادلوں کا پردہ ڈال دیتے۔

جھول جزیرے میں ارد اور رت کا رقص صدیوں سے جاری تھا۔ ارد اور رت سانورد اور سمرت کے زنگی غلام تھے۔

رت سمرت کی باندی تھی۔

ارد سانورد کا بردا تھا۔

سبز پیالے کے اکھاڑے میں گونگا ارد اور اندھی رت لڑ لڑ کر لہولہان ہو جاتے۔ اور پھر پریم جھیل کے کنارے پڑے سسکیاں بھرتے۔ دونوں ہی مظلوم تھے۔ ان کی دُنیا تیرہ و تار تھی۔ ان کی کائنات الم و ایذا سے بھری تھی۔

گونگا ارد جذبات کے کوڑوں سے استادہ ہونے پر مجبور کر دیا جاتا۔ اس کا پایہ ستون زنجیروں سے جکڑ کر بلویا جاتا۔ تناؤ سے بند بند ٹوٹتا۔ ایسے معلوم دیتا جیسے اہرامِ مصر کا کوئی حبشی معمار ہو جو کسی فرعون کے کوڑے تلے بلبلا رہا ہو۔ یا جیسے ہمالیہ کی کسی تاریک کھوہ میں ایذا پرست یوگی تن تن کر اپنی ہڈیاں توڑ رہا ہو۔

اندھی رت عمیق گہرائیوں میں محصور تھی۔ اس کے پاؤں میں پُراسرار بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، جس طرح کھُلے سمندر میں سطح پر بڑے بڑے ڈھول نما پیپے بظاہر آزادانہ تیرتے ہیں، لیکن در پردہ زنجیروں سے بندھے ہوتے ہیں۔

کوئی تیرہ و تار دُھنکی رت کا بند بند دھنکتی تھی۔ کوئی پُراسرار ضرب پڑتی جس کی لرزش اسے گود میں لے کر جھُلاتی۔ اتنا جھُلاتی کہ جھولن عذاب کی شکل اختیار کر لیتی۔

پھر کوئی خفیہ آتش فشاں زُوں سے پھٹتا۔ لاوے کا دریا بہنے لگتا، جس کے کنارے ارد اور رت لہولہان پڑے سسکتے رہتے۔

اور ستارے بڑ بڑ انھیں دیکھتے۔

ہاں، ستارے انھیں دیکھ دیکھ کر کبھی نہ اُکتاتے تھے۔ ایک کہتا "رت اور ارد کا پریم ناچ کتنا جاذب ہے۔" دُوسرا بولتا "پریم تو بہانہ ہے۔ یہ تو یُدھ ناچ ہے"۔ تیسرا کہتا "نہ پریم نہ یدھ، یہ تو مستی کا اظہار ہے۔" چوتھا غصّے میں چلاّتا "اندھے ہو؟ تمھیں مجبوری اور لاچاری مستی نظر آتی ہے؟ تم نہیں جانتے کہ اس سنسار کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے پریم قدرت کی ایک چال ہے؟"

کُچھ ستاروں کا خیال تھا کہ ارد اور رت سانورد اور سمرت کے ہاتھوں مظلوم ہیں۔

کچھ کہتے، نہیں۔ سمرت اور سانورد رت اور ارد کے ہاتھوں مظلوم ہیں۔

پھر بُوڑھا ستارہ آہ بھر کر گُنگنا تا "مت دیکھو۔مت دیکھو۔ دیوتاؤں کے بھید جانے بغیر تم دیکھ نہیں سکتے۔ پھر دیکھنے کا فائدہ ؟"

کوئی اس تماشے کا بھید نہیں جانتا تھا۔ دیوتا خود حیران تھے۔ انھیں صرف ظاہر کا پتا تھا۔ بھیتر کی بات صرف پرمیشور جانتے تھے۔

دیوتاؤں کا کہنا تھا کہ جب پرمیشور نے سالنورد اور سمرت کی تخلیق کی تھی تو ان کے پاؤں میں ارد اور رت کی بیڑیاں نہ تھیں۔ اس وقت وہ صرف منش اور استری تھے۔ منش میں ڈنک نہ تھا۔ استری میں نار نہ تھی۔ اس وقت وہ مرد اور عورت تھے۔ مرد میں ارد نہ تھا۔ عورت میں رت نہ تھی۔

پرمیشور نے سمرت کے جیو میں پریم جھولنا لگا دیا، اور سالنورد کے جیو میں سوچ اُڑان بھر دی۔ سمرت کا دھیان سالنورد سے جوڑ دیا اور سالنورد کا آکاش کی طرف موڑ دیا۔ سمرت کی سوچ کے ماتھے پر آج کی بندیا لگادی۔ سالنورد کی سوچ میں آوارگی بھر دی۔

سالنورد سے کہا "جا، تُو آکاش میں آوارہ رہ۔" سمرت سے کہا "جا، تیرا کام یہ ہے کہ سالنورد کو گھسیٹ کر دھرتی پر لا" ــــــ پھر انھیں جھول جزیرے پر اُتار دیا۔ صدیاں بیت گئیں۔

پھر ایک دن اتّفاق سے دیوتاؤں کا اُدھر سے گزر ہُوا۔

کیتو مہاراج نے حیرت سے جھول جزیرے کی طرف دیکھا۔ بولے "یہ کون سی جگہ ہے ؟"

سندھو مہاراج نے جواب دیا "یہ جھول جزیرہ ہے۔"

"پرنتو یہاں آنند کا سماں کیوں نہیں ؟ چندر مہاراج نے پُوچھا۔

"ہاں" کیتو گنگنائے "یہاں سے دُکھ کی باس آ رہی ہے۔"

اج مہاراج ہنسے۔ کہنے لگے "پریم جھولن میں دُکھ کیوں؟"

دیوتاؤں کو دیکھ کر سمرت اور سانورد بھاگے بھاگے آئے "جے ہو مہاراج کی۔ دھن بھاگ ہمارے۔"

"تُم یہاں آنند سے ہو نا؟" چندر مہاراج نے پُوچھا۔

"پریم جھولن میں بیٹھے ہیں تو آنند ہی ہوگا" سندھو نے کہا۔

سمرت ہاتھ جوڑ کر بولی "پریم تو ہے، مہاراج، پرنتو جھولن نہیں۔"

"جھول جزیرے میں جھولن نہیں؟" اج مہاراج نے حیرانی سے پُوچھا۔

"ہاں، مہاراج" سمرت بولی "پریم چکر سمان چلتا ہے، جھولن سمان نہیں۔ جو چکر سمان چلے وہ کشٹ بن جاوے ہے۔"

"جھولن سمان کیوں نہیں چلے ہے؟" کیتو نے پُوچھا۔

"مہاراج" سمرت نے کہا "جھولن سمان تو تبھی چل سکے ہے جب بڑھے، رُکے، مڑے اور پھر سے بڑھے، جیسے لہر چلے ہے، مہاراج۔"

"سچ کہتی ہے" چندر بولے "جو چکر سمان چلتا ہی جاوے ہے، وہ کشٹ بن جاوے ہے۔ جو رُک رُک کر لہر سمان چلے، سو آنند۔"

"مہاراج" سمرت نے ہاتھ جوڑ کر کہا "اس پریم چکر نے میری سُدھ بُدھ مار دی ہے۔ اور مہاراج خود سُدھ بُدھ ہی نہ ہو تو آنند کیسا؟"

"سچ ہے" اج مہاراج بولے "تُو تُو کہنے والے کو جب میں کی سُدھ نہ رہے تو سمجھ جان لو کہ نہ تُو رہا نہ میں رہی۔"

"تُو نہیں بولتا، سانورد؟" کیتو نے پُوچھا۔

"یہ کیوں بولے گا، مہاراج" سمرت بولی "یہ تو میرا 'تُو' ہے۔ اور اپنے کارن یہ میں ہی میں ہے۔ اور مہاراج، جو میں ہی میں ہو اسے پریم سے واسطہ؟ مجھ پر دیا کرو، مہاراج" سمرت گھٹنے ٹیک کر

کھڑی ہو گئی۔

اج مہاراج بولے "جا، تیری اکشا پوری ہو گی۔ پریم چکمہ پریم جھولن میں بدل جائے گا۔ جب پریم ہلارے اتنے بڑھ جائیں گے کہ دم گھٹنے گا تو بھونچال آجائے گا، لاوا بہ نکلے گا اور تو شانت ہو جائے گی"۔

"دھن ہو، مہاراج، دھن ہو" سمرت پھول سمان کھل گئی۔

اج مہاراج نے تالی بجائی۔ ارد اور رت ہاتھ باندھے آ کھڑے ہوئے۔

"یہ تمھارے بردے ہیں۔

سمرت، رت تیری باندی ہے۔

سانورد، ارد تیرا بردا ہے۔

جب پریم کشٹ بن جائے تو ارد اور رت آجایا کریں گے۔ یہ پریم یدھ ناچیں گے۔ پھر کشٹ آنند میں بدل جائے گا"۔

"دھن ہو، مہاراج، دھن ہو" سمرت خوشی سے چلائی۔

"پر ایک بات کا دھیان رکھنا" اج مہاراج بولے "ان بردوں کو نیچ نہ جاننا۔ ان کا اپمان نہ کرنا۔ یہ سچ کے پجاری ہیں۔ ان کی شان بڑی اونچی ہے۔ ان میں لوپترتا کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ انھیں دیوتا سمان جاننا۔ آرتی چڑھانا۔ جے بلانا۔ انھیں لوبھ کے لیے برتو گے، ان کا تماشا بناؤ گے تو ان کا اپمان ہو گا ـــــــــ ایسا ہوا تو ارد میں اچھل نہ رہے گی۔ اس کا سر نیچا ہو گیا تو پریم جھولن ٹوٹ جائے گا اور لوبھ چکر چل پڑے گا۔ جب ایسا ہوا تو جان لینا وہ دھرتی کے آخری دن ہوں گے۔

نیویارک کی نیوڈلیوڈ کلب میں ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تماشائی آخری منظر دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔ نسیں تن تن کر بجنے لگی تھیں۔

تماشائیوں کے جسم لٹے پٹے تھے۔ جنس کے عفریت کے روندے ہوئے الاٹے ہوئے۔ جذبۂ محبت شہوت کے گاڑھے بلبے کی دلدل میں بدل چکا تھا۔ خواہش جسم سے چوچو کر ذہن میں آجمع ہوئی تھی۔ ذہن بھڑوں کے چھتے کی طرح بھن بھن کر رہے تھے۔

آخری سین ارد اور رت کا ناچ تھا۔

دفعتہً پردہ اُٹھا۔

سٹیج پر اندھی رت انگڑائیاں لے لے کر اپنی ہڈیاں توڑ رہی تھی۔ اس کے بدن کی تاریں جھن جھن کر رہی تھیں۔

سرتیاں بج رہی تھیں۔

پھر آرکسٹرا سے دف کی آواز اُبھری، آدم خور حبشیوں جیسی۔ رت کے سینے کے دونوں بڑے دھاگے ترکٹ ناگے بجنے لگے۔ پھر اس کے جسم سے جنس کا خوف ناک بُلاوا گونجا ــــــــ ہال میں اِک زلزلہ آگیا۔ سٹیج کے ونگ سے گونگے ارد کی چنگھاڑ سنائی دی، زخمی چنگھاڑ جیسے رِنگ میں داخل ہونے سے ہچکچانے والا سرکس کا شیر دھاڑتا ہے۔ پھر کوڑوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ دو، چار، سات، اور آخر گونگا ارد چیختا چلاتا سٹیج پر آکھڑا ہوا۔ اس کے آبنوسی جسم پر کوڑوں کی شنگرفی دھاریں پڑی ہوئی تھیں، جن سے خون رس رہا تھا۔ ارد نے رت کی طرف دیکھا اور جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

تڑاخ! ونگ سے ایک ہنٹر لہرایا۔ اُچھل اُچھل۔ رِنگ ماسٹر کی زہریلی گونجی۔

ارد درد سے بلبلا کر اُٹھا، ایک جست بھری۔ لیکن اس میں اُچھل پیدا نہ ہوسکی اور وہ مُنھ کے بل گر گیا۔

تماشائیوں کی غیظ و غضب بھری آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ سب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"مینجر! مینجر" رِنگ ماسٹر مینجر کی طرف بھاگا "سر، آج پھر ارد میں اُچھل پیدا نہیں ہوسکی۔ وہ سٹیج پر مُنھ کے بل گرا پڑا ہے۔ شو رُک گیا ہے۔ تماشائی توڑ پھوڑ پر آمادہ ہیں!!"

مینجر اُٹھ کھڑا ہوا۔ چلّا کر بولا "پردہ گرا دو۔ اِنتظار فرمائیے کا کیپشن لگا دو۔ تُم نے شو سے پہلے پری کاشن لیے تھے؟" اس نے پُوچھا۔

"ہم نے کوڑے لگائے تھے، سر، بجلی کے کوڑے" رِنگ ماسٹر نے جواب دیا۔

"اُونہوں" مینجر نے جواب دیا "اب کوڑے کام نہیں آئیں گے۔ ڈاکٹر کہاں ہے؟ اسے بُلاؤ۔ بولو، ڈبل انجکشن دے دے۔"

سٹیج پر پہنچ کر مینجر نے زخمی ارد کو جھنجھوڑا "اَپ، مَین، اَپ" وہ بولا "دی شو مسٹ گو آن۔"

ٹھرڈ مین

ہاسٹل چھوڑ کر میں اپنے کزن کے گھر اونچے محلّے میں مقیم ہُوا تو پہلے دن ہی محلّے کا رنگ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہاں تو بڑا بڑا مال پڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اِس پُرانے آثارِ قدیمہ میں میلی کچیلی، نمازیں پڑھنے والی، آلو چھیلنے والی لڑکیاں ہوں گی۔ پر وہاں تو گویا انڈر گراؤنڈ انڑ کان کُھلا تھا۔ وہاں تو ایک سے ایک پٹاخا تھی۔ سب بنی بجی ہُوئی۔ تیز۔ بے باک۔

اس پر میرا کزن بولا "ابھی تو تُو نے زردی کو نہیں دیکھا۔ دیکھے گا تو مزاج ٹھکانے آجائیں گے۔"

"وہ کیا چیز ہے، زردی؟"

"بس ایک چیز ہے۔"

"کھانے کی، پینے کی یا سونگھنے کی؟"

"کھانے کی" وہ ہنسا "محلّے کے لڑکے اسے زردہ بھی کہتے ہیں۔ پر وہ میٹھی نہیں۔ مرچیلی ہے۔ سُوں سُوں کرو گے۔"

جب میں نے زردی کو دیکھا تو چیخ کر بولا "ارے! یہ تو آسیہ ہے۔ میری ہم جماعت۔"

"سچ؟ تم اسے جانتے ہو؟"

"جانتا ہُوں۔ ارے بھئی، ہمارا تو پُرانا یارانہ ہے۔"

کالج میں پہلے دن جب میں نے آسیہ کو دیکھا تھا تو میرا جی چاہا تھا کہ اس کا مُنہ چڑا کر آگے نکل جاؤں۔ چھوٹا قد۔ چوہیا سا مُنہ۔ تکونی ناک اور ہلدی سا رنگ۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پر پُرزے نکالے۔ کتر کتر باتوں کی قینچی چلائی۔ فقرے بازی

کی تلوار لہرائی اور بالآخر کالج کے نعرہ بازوں کو میدان میں کھڑے ہو کر للکارا۔ اس پر وہ چلّائے "ارے! یہ تو اندر سے بھاما جھا نکلی۔"

"اور تم" وہ بولی "تم پھوپھی نتھو نکلے۔"

اسی روز سے آسیہ کی دھاک بندھ گئی اور لڑکے اس کی عزت کرنے لگے۔

اُدھر نچلے محلّے میں رنگ رنگ کی لڑکی تھی۔ پر تھیں ساری ہی دو رُخی۔ بڑوں کے سامنے "جی جی، ہاں جی۔" لڑکوں کے سامنے "دیکھ! ذرا ہٹ کے گزر لو۔"

چند ایک خالی ہاں بھی، ہاں جی بھی تھیں۔ نمازی نگاہیں۔ رسمی اسلام سے بھیگے ہوئے پر۔ ہائیں! ایسا ہوتا ہے! سا انداز۔ سیدھی لکیریں۔ سپاٹ۔ چلتی پھرتی ڈیڈ باڈیز۔ بیشتر دو رُخی تھیں۔ گھر کچھ، باہر کچھ۔ باہر کھلے بال۔ "سوو ہاٹ" نگاہیں۔ اُبھرا سینہ۔ چلتی آنکھیں۔ محلّے میں داخل ہوتے ہی بکل بکل۔ نیچی نگاہیں۔ "ہمیں کیا خبر" سا انداز۔

باہر بھی تو دو رُخ تھے۔ دو رنگ۔ اکیلے میں "ہم نہیں جانتے" کا بہروپ۔ بناوٹی وقار۔ دکھاوے کا "ہٹا جی ہمیں کیا لینا دینا"۔ چار ایک اکٹھی ہوتیں تو قہقہے، اشارے۔ راہ چلتے کو چھیڑتیں "کتنا بنتا ہے یہ۔"

"اپنے کو شکیل سمجھتا ہے کہ وحید مراد۔"

"رس گلاّ ہے، پر شیرا کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہے۔"

"ہٹاؤ۔ بے چارے کے لیے چلنا مشکل ہو رہا ہے۔"

محلّے میں زردی کا رنگ ہی اور تھا۔ کالج میں تو صرف تیز ہی تھی، یہاں دُو رمار بھی تھی۔ وہ سامنے بیٹھ کر بات کرنا بھی جانتی تھی اور محلّے میں کھڑکی بازی اور منڈیر بازی کا فن بھی جانتی تھی۔ محلّے کے لڑکوں کو اُنگلیوں پر نچاتی تھی۔ جو بھی اس کی کھڑکی کی زد میں آتا، اسے ایک جھنجھناہٹ ضرور دیتی۔ جبھی تو لڑکوں نے کہا "ارے! یہ زردی تو نہیں، یہ تو زردہ ہے زردہ۔"

زردی کی شوخی کی وجہ اس کی اماں تھی۔ ایسی خودسر تھی وہ کہ اس نے زردی کے ابّا کو

ہاں جی ہاں جی بنا رکھا تھا۔ خوش مزاج تھی، بانکی تھی، کھلاڑی تھی۔ بس چلتا تو اب بھی قینچی سی چل جاتی۔ اسی لیے بیٹی کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی اس نے۔

کالج میں زردی سے میری فقرے بازی چلتی تھی۔ محلّے میں آنکھ مٹکا۔ میرا کیا، سب کا چلتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ محبت کا دور ختم ہو گیا۔ اب ہم کسی کے لیے آہیں بھرنے کے لیے تیار نہیں۔ نہ ہی ہم سے تارے گنے جاتے ہیں۔ ہمارا کام تو چھیڑ چھاڑ ہے۔ اُس سے دل لگی کی۔ اس کا مذاق اُڑایا۔ اِس کو چھیڑا، اُس سے فقرے بازی کی۔ محبت وحبت نہیں ہوتی۔ ہاں کوئی پسند آجاتی ہے، کوئی نہیں آتی۔ جو پسند آجائے اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آجکل لڑکی کو اکیلے میں لے جانے کا شوق کم کم ہوتا جا رہا ہے۔ پُرانے زمانے میں تو صرف یہی ایک بات سُوجھتی تھی۔ سُوجھتی کیا، سر کو چڑھ جاتی تھی، جس طرح وسکی چڑھ جاتی ہے۔

ویسے ایسی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں جو اکیلے میں لے جانے کی آرزو پیدا کرتی ہیں۔ لیکن ایسی لڑکیاں بہُت کم ہوتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں محلّے میں بھی تھیں۔ جو خالی اکیلے میں لے جانے والی تھیں۔ لڑکے انھیں لے بھی جاتے تھے۔ وہ چلی بھی جاتی تھیں۔ پر دل میں ان کی عزّت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ نہ ہی تأثر پیدا ہوتا تھا۔ بات وہیں اکیلے میں شرُوع ہوتی، اور وہیں ختم ہو جاتی۔ کیری ہوم قسم کا تأثر پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو یہ جانتا ہُوں کہ ایسی لڑکیاں باقی باتوں میں نُون غنا ہی ہوتی ہیں۔

پھر وہ "ڈیڈی لانگ لگز" بھی تو تھا، جس کی وجہ سے یہ سارا بکھیڑا پڑا، جسے تم کہانی سمجھ کر پڑھ رہے ہو۔ وہ میرا کزن قمر تھا، جسے میں مذاق سے ڈیڈی لانگ لگز کہا کرتا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے بارہ پندرہ سال بڑا تھا۔ اور صرف عمر میں ہی بڑا نہیں تھا، اندر سے سکہ بند بڑا تھا۔ آجکل یہ فیشن چل رہا ہے نا کہ بڑے مور کے پر لگا لیتے ہیں، اور کہتے ہیں، ہم تو نوجوان ہیں۔ قمر نے بھی مور کے پر لگا رکھے تھے اور برتاؤ میں نوجوان دکھتا تھا۔

قمر تھا بڑے مزے کا آدمی۔ نہ عقل چھانٹتا تھا نہ فلسفہ بھگارتا تھا۔ اور نصیحت تو اس نے

کبھی کی ہی نہ تھی۔ کرتا بھی تو ایسے کہ وہ فضیحت معلوم دیتی۔ میں چلّا کر بولتا تو کان پر ہاتھ رکھ کر کہتا "یار، ذرا اُونچا بولو۔ میں سُن تو سکوں۔" ہنسنے والی بات پر قہقہہ نہ لگاتا تو وہ کہتا "یار ہنسنا نہیں جانتے تو رو ہی دو۔"

روز شام کو جب میں کالج سے لوٹتا تو کہتا "ہاں، بھئی۔ رپٹ لکھواؤ۔ کس کس لڑکی کا مُنھ چڑایا؟ کس کس سے بے عزّتی کروائی؟ کس کس کے گلے میں بانہیں ڈالیں؟ کس کس پر فقرے کسے؟ کس کس سے وسپرنگ کی؟ اور کیا کیا کیا؟ سب تفصیلات سنسر کے بغیر۔

چُھٹّی کے دن وہ مجھے زبردستی کوٹھے پر لے جاتا۔ "بھئی، بڑے بداخلاق ہو۔ تمھاری خاطر وہ سب اپنے اپنے کوٹھے پر آئی ہُوئی ہیں، اور تم نیچے بیٹھے ہو۔ واہ!" وہ مجھے کوٹھے پر نمایاں مقام پر بٹھا دیتا اور خود اوٹ میں بیٹھ رہتا۔ پھر دفعتہً گنگناتا: باادب، باملاحظہ، ہوشیار! ملکہ معظمہ تشریف لے آئیں۔ کورنش بجالاؤ۔"

وہ وہاں اوٹ میں بیٹھا، محلّے کے کوٹھوں پر رننگ کمنٹری کرتا رہتا اور ساتھ ہی مجھے داد بتاتا رہتا "آگئی، آگئی، سالی۔ جانے نہ پائے۔ شاباش! شاباش! لگاؤ چھکّا۔"

مجھے کوٹھے بازی نہیں آتی۔ میں تو سامنے بیٹھ کر بات کرنے کا قائل ہُوں۔ سچّی بات یہ ہے کہ میں لڑکی کے آگے پیچھے نہیں پھر سکتا۔ مجھے تو وہ لڑکی اچھّی لگتی ہے جو میرے آگے پیچھے پھرے، مجھے منائے جیسے دیوتا کو مناتے ہیں۔ میرے بغیر اس کا دم نکلے۔ میں کسی کے پیچھے پھرنا پسند نہیں کرتا۔ پھروں بھی تو خود کو دھوکا دیتا رہتا ہُوں کہ پیچھے پیچھے میں نہیں پھر رہا، وہ پھر رہی ہے۔

لڑکی کو بھرمانے، پھنسانے کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ کوئی پیچھے پیچھے پھر کر بھرماتا ہے۔ کوئی گلیڈ آئی جما کر پھنساتا ہے۔ کوئی مجنون سی آنکھیں بنا کر تکے جاتا ہے۔ کوئی محبّت کے ڈائیلاگ بولتا ہے۔ کوئی میری طرح بے نیازی کا پوز بنا کر توجّہ طلب کرتا ہے۔

جبھی تو میں نے زردی کو کبھی زردہ کہہ کر نہیں بُلایا تھا۔ اُلٹا جب بھی کینٹین میں ہم اکٹھے

بیٹھتے تو میں موقع کی تاک میں رہتا۔ جب بھی وہ میری طرف دیکھتی تو میں کہتا "اونہوں! نادیدی۔ یوں نہ دیکھ میری طرف، جیسے میں حلوے کی پلیٹ ہوں"۔ اس پر قہقہہ مار کر کہتی "سچی، مجھے تو اُبلے چاولوں کا تھال نظر آتے ہو"۔

زردی کو کپڑے پہننے کا بڑا شوق تھا۔ رنگ کا بڑا سنس تھا۔ یوں رنگ سے رنگ جوڑتی کہ مزا آ جاتا۔ اور پھر اس کے لباس میں ایک نا ایک چیز فیشن سے ہٹ کر ہوتی۔ اور وہ چیز یوں توجہ پکڑتی جیسے چیونٹی ہو۔ وہ چیونٹی جو کاغذوں پر لگاتے ہیں۔

اس کے ڈریس کو دیکھ کر کوئی نا کوئی ضرور بول اُٹھتا "واہ، بھئی واہ!" اس پر زردی بڑی بے نیازی سے کہتی "مفت میں واہ وا نہ کر، بلاک ہیڈ۔ یہ لباس تو لنڈے کا مال ہے"۔ یا کہتی "اونہوں! اسے چھونا نہیں۔ یہ میکسی تو کسی مری ہوئی میم کی ہے"۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتی تھی "بھئی، ہم تو لنڈا مار کہ ہیں"۔

یہ سچ تھا کہ اس کے بیشتر لباس لنڈے کے ہوتے تھے۔ خریدتی لنڈے سے ہی تھی لیکن انھیں اتنا بنا سجا کر پہنتی کہ لباس منفرد ہو جاتا۔ ایک بار میں نے اس پر فقرہ کسا۔ میں نے کہا "ہیلو، لنڈا مارکہ"۔ جواب میں بولی "ہائے، لنڈا مین۔ کیسا جوڑا رہے گا؟ میرا لباس لنڈے کا، تیرا ذہن لنڈے کا"۔

بڑی تیز تھی وہ۔ اور پھر مزے کی بات یہ تھی کہ وہ کسی کو خصوصی توجہ نہیں دیتی تھی۔ یا شاید ہر کسی کو خصوصی توجہ دیتی تھی۔ ابھی تم فیڈ اِن ہوئے، ابھی فیڈ آؤٹ۔ اور کوئی اور فیڈ اِن۔ یہ فیڈ اِن فیڈ آؤٹ کا سلسلہ چلتا ہی رہتا تھا۔ ایک جگہ پر توجہ نہیں ٹکتی تھی اس کی۔ سالی ہرجائی تھی۔ عوامی تھی۔ حرامی تھی۔

کچھ بھی تھی، مجھے پسند تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر نوک جھونک کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ میں اکثر تاک میں کھڑا رہتا کہ آئے تو اس کے ساتھ گپ لگاؤں۔ آتی تو اُوپر اُوپر سے یوں ظاہر کرتا جیسے اس نے مجھے تلاش کر کے پا لیا ہو۔ نہ آتی تو میرے اندر چڑچڑی چلتی رہتی کہ

کب آئے گی۔ کب آئے گی۔ آجاتی تو چھوٹتے ہی کنتر کنتر باتیں کرنے لگتی۔ پھر میں چلاتا "لو، چل پڑی چکّی ۔" آسیہ کا لفظی مطلب چکّی ہے نا۔ اور وہ ہنس کر کہتی "کیوں نہ چلے؟ تمھیں جو پیسنے کا شوق ہے۔ ابلاغ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

صرف لڑکوں کے ساتھ ہی نہیں، وہ پروفیسروں کو بھی نہیں بخشتی تھی۔ کلاس میں بات کرنے سے باز نہ آتی۔ اکنامکس پر اکثر فقرے کستی۔ پروفیسر پوچھتا "سمجھ گئی؟" تو وہ کہتی "ہاں، اب سمجھی کہ اکنامکس وہ سائنس ہے جس کے اصول روز بدلتے ہیں۔ سوال وہی رہتے ہیں۔ جواب بدل جاتے ہیں۔"

میں تو ہاسٹل چھوڑ کر کبھی نہ جاتا پر قمر نے مجھے زچ کر دیا۔ پہلے تو مُنھ زبانی کہتا رہا، پھر ایک دن ویگن لے کر آ گیا اور مجھ سے کہے بغیر میرا سامان اُٹھا اُٹھا کر ویگن میں رکھنے لگا۔ میں نے پروٹسٹ کیا تو بولا "یہ رسی دیکھتے ہو؟ اگر تم بولے تو مُشکیں کس کر لے جاؤں گا۔" پھر منّتوں پر آ گیا۔ کہنے لگا "یار، میں اتنے بڑے گھر میں اکیلا رہتا ہوں۔ بات کرنے کو زبان ترس جاتی ہے۔ چند مہینوں کے لیے میرے پاس آ رہو گے تو تمھارا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ میری بات بن جائے گی۔"

قمر کی شادی تو دس سال پہلے ہو چکی تھی لیکن کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ بیوی مسلسل بیمار رہتی تھی، اور اسی بیماری کی وجہ سے ایک سال پہلے فوت ہو چکی تھی۔ اب گھر میں ایک وہ خود رہتا تھا اور ایک اس کا نوکر، ننّھا۔ اس کا گھر بھی تو ہوسٹل کی طرح چھڑیوں کا ڈیرا تھا۔

قمر ویسے تو بزنس مین تھا، لیکن طبیعت میں ذرا بھی بزنس کا رنگ نہ تھا۔ نہ گنتی، نہ حساب کتاب، نہ پیسہ پیسہ۔ اس کے باوجود سالا پیسے والا تھا۔ سو پچاس کا خرچہ تو بے دریغ کر دیتا تھا۔ رنگین طبیعت تھا۔ ہر لڑکی میں دلچسپی لیتا تھا۔ زردی میں تو خاص دلچسپی لیا کرتا۔ لیکن اس کی دلچسپی عجیب رنگ کی تھی۔ خود سامنے نہیں ہوتا تھا۔ کسی لڑکی کے سامنے نہیں

آتا تھا۔ خود چُھپ چُھپ کر دیکھتا، مجھے سامنے کھڑا کر دیتا، اور پھر اُکساتا "دیکھ، دیکھ، اندھے" وہ چلّاتا "وہ سامنے۔ آج تو بلیک اور ریلو کا کمبینیشن مارا ہے۔ بل بل بل بل۔ ارے احمق! کر اشارہ۔ گیا دے۔ او ہو! کھو دیا۔ سٹوپڈ۔"

"ارے یار تُو تو بالکل اناڑی ہے" وہ مجھ سے کہتا "یہ لڑکیاں خالی اشاروں سے قابو میں نہیں آتیں۔ کبھی انٹر کان لے جا، کبھی فلم دِکھا، کبھی پک نک۔ خرچے کا فکر نہ کر۔ بس مجھے دِن اور وقت بتا دیا کر۔ ریزرویشن میں کرا دیا کروں گا۔" میں نے کئی بار کہا تھا "چل، تینوں اکٹھے چلتے ہیں۔" "نہ نہ" وہ چلّاتا "بھئی، اپنا اپنا کام ہے۔ تو اپنا کام کر، میں اپنا۔ تم فلم دیکھو، میں اِنتظام کروں گا۔ جس کا کام اسی کو ساجے۔" ایک دن میں نے بہت ضد کی تو وہ بولا "اچھا، چلو۔ میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ مگر تمھارے ساتھ نہیں بیٹھوں گا۔ تم اگلی سیٹوں پر بیٹھنا، میں پچھلی سیٹوں پر۔ لیکن اسے پتا نہ چلے کہ میں ساتھ ہوں۔"

ایک روز کہنے لگا "یار، اسے یہاں لے آؤ۔"

"یہاں کہاں؟"

"گھر میں اور کہاں۔"

"تم بھی ہو گے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے، نہیں، سٹوپڈ۔ تیسرے آدمی کا کیا کام۔"

"یار، تمھیں پتا بھی ہے، میری تو اس کے ساتھ خالی گپ شپ چلتی ہے۔"

"تو وہی چلا دینا۔"

"نانسنس! اکیلے میں گپ شپ نہیں چلتی۔"

"تو اکیلے میں کیا چلتا ہے؟"

"بالکل ہی بودم ہو، یار" وہ ہنستا۔

واقعی میں خود کو بودم محسوس کر رہا تھا۔ بات جو پلّے نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ کیسی دلچسپی

تھی کہ خود اوٹ میں رہنا اور دوسرے کو شہ دینا۔ آگے کرنا۔ گرمانا۔

انہی مشاغل میں کئی ایک مہینے گزر گئے۔ پھر ہمارے امتحان آ گئے۔ امتحانوں کے دوران میں نے ایک حیران کُن بات سُنی۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔

اس روز ہمارا محلّے دار علیم اور میں کینٹین میں زردی کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ فائنل امتحان کے دن بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے بچھڑنے کا احساس طاری ہو جاتا ہے۔ سبھی جذباتی ہو جاتے ہیں۔ پر اُوپر سے ظاہر کرتے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

میں نے برسبیلِ تذکرہ پوچھا "سُنا، آسیہ، امتحان کے بعد کیا پروگرام ہے تیرا؟"

علیم جھٹ بولا "وہی جوان بیبیوں کا ہوتا ہے۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہانڈی روٹی کرے گی، بیڈ ڈیوٹی دے گی اور بچے پالے گی۔"

زردی کے مُنھ پر سُرخی کی رو دوڑ گئی۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ بولی "وہ تو ہے۔ پیڑھی پر بیٹھوں گی، چوڑے والی بانہہ چھڑکاؤں گی، اور حُکم چلاؤں گی۔ یہ کیوں جلتا ہے؟" اس نے علیم کی طرف اشارہ کیا اور ہنس کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد علیم بولا "اس کا بیاہ ہو رہا ہے۔"

"سچ؟"

"تجھے نہیں خبر؟"

"نہیں تو۔"

"سالے، بنتا ہے۔ تیرے کزن قمر سے بیاہ ہو رہا ہے، اور تجھے پتا نہیں۔"

میرا فلوس اُڑ گیا۔ اسی رات میں نے ڈیڈی لانگ لگز کو گلے سے پکڑ لیا۔

میں نے کہا "ابے! ہم سے چارسو بیسیاں کرتا ہے۔"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"زردی سے بیاہ کر رہا ہے، تُو؟"

"پتا نہیں" وہ بولا۔

"پتا نہیں کے بچے، سارے محلّے میں خبر اُڑی ہُوئی ہے۔"

"شاید ہو جائے۔ تجھے کیوں درد اُٹھنے لگا؟"

"اس عمر میں کالج کی لونڈیا سے بیاہ کرے گا؟"

"میں نہیں کروں گا، کالج کی لونڈیا سے۔"

"تو پھر؟"

"وہ کرے گی، مجھ سے۔"

میں نے قہقہہ لگایا۔

پھر وہ دفعتہً سنجیدہ ہو گیا۔ بولا "یار، اگر تم خود انٹرسٹڈ ہو تو میں ابڈیکیٹ کر دُوں۔"

"نہیں، نہیں۔ میرا کوئی ارادہ نہیں۔"

"تو پھر تو چیختا کیوں ہے؟"

"کوئی جوڑ بھی ہو۔" میں چلّایا۔

"ارے، تجھے بات کا تو پتا نہیں۔ پیغام میں نے نہیں بھیجا، اُدھر سے آیا ہے۔ جھولی میں گرا انگور کون چھوڑتا ہے۔"

"جُھوٹ بکتا ہے۔"

"آنسٹ ٹرودتھ" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہونا چاہیے تو نہیں تھا، پر ہو گیا ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔"

پتا نہیں مجھے غصّہ کیوں چڑھا ہُوا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا، جیسے اس نے میرے

ساتھ دھوکا کیا۔ زردی کو فریب دیا ہو۔

اسی رات جب میرا غصّہ ٹھنڈا ہُوا تو قمر نے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی۔ کہنے لگا "ماسی مہراں کو جانتے ہو؟"

"کون ماسی مہراں؟"

"محلّے کی ہے۔ دلالہ ہے۔ رشتے کراتی ہے۔ میں نے ماسی مہراں کو کہہ رکھا تھا کہ کوئی رشتہ تلاش کر دے۔ میں نے لڑکی کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں نے تو کہا تھا کسی عمر کی ہو، کسی گھرانے کی ہو، چاہے بیوہ ہو۔ جہیز نہیں لوں گا۔ لیکن ایک شرط ہے۔ خالی آلو چھیلنے والی نہ ہو۔ جان دار ہو، تیکھی ہو، بات کرنا جانتی ہو، شکل کی اچھی ہو۔ مجھے کیا پتا تھا کہ جواب میں زردی کا رشتہ آ جائے گا۔"

"تمھیں تو زردی کی ماں سے بیاہ کرنا چاہیے، زردی سے نہیں۔"

"منظور، بالکل منظور" وہ چلّایا "وہ تو زردی سے بھی بہتر ہے۔ پر اس کے خاوند کو کون اِغوا کرے گا؟"

"لیکن زردی کیسے راضی ہو گئی؟"

"یہ تم اس سے پوچھو" وہ بولا "بلکہ مجھے بھی بتانا کہ وہ کیا کہتی ہے۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا" میں نے کہا۔

"سیدھی بات ہے" وہ بولا "اس کی ماں بڑی سیانی ہے۔ اس نے دیکھا کہ بیٹی کو کھاتا پیتا گھر ملے گا اور وہ بھی مُفت میں۔ جہیز کا ٹنٹا نہیں۔ مہر جتنا مرضی لکھوائے۔ گھر میں نہ ساس نہ سسر۔ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔"

"خبیث سرمایہ دار" میں نے کہا "پیسے کے زور پر لڑکیوں کو پھنساتا ہے تُو؟"

"میں کہاں پھنساتا ہوں۔ آجکل کی لڑکی خود سُنہری کُنڈی پر لگتی ہے۔ یہ کالج والیاں جو ہیں، سب بنگلا اور کار کے خواب دیکھتی ہیں۔ تمھاری نسبت مجھ ایسے رشتے کی اُمّید

رچائے بیٹھی ہیں، مسٹر سوشلسٹ۔ زیور ہو، کپڑا ہو، سوشل لائف ہو جس میں وہ بیر بہوٹیاں بن کر بیٹھ رہیں۔"

امتحان ختم ہُوا تو میں گھر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس پر وہ غصّے سے بھُوت بن گیا۔ بولا "گھر جاکے کیا کرے گا تُو؟ مکھیاں مارے گا نا۔ وہ تو یہاں بھی مار سکتا ہے۔ نوکری وکری نہیں ملے گی۔ وہاں جہلم جاکر کیا کرے گا؟ وانٹڈ کالم پڑھے گا۔ عرضیاں لکھے گا۔ یہاں بیٹھ کر بھی یہ کام ہو سکتا ہے۔"

"نہیں" میں نے کہا "میں جا رہا ہُوں۔"

"وہاں تیرے مُنہ کو پھپھوندی لگ جائے گی۔ کوئی بات کرنے کے لیے بھی نہیں ملے گی۔"

"یہاں ملے گی کیا؟"

"بالکل ملے گی۔ ایک مہینے کے اندر اندر وہ جو آ رہی ہے اس گھر میں۔ اس سے سارا دن باتیں کیا کرنا۔"

"بک نہیں" میں نے غُصّے سے کہا۔

"غصّے کیوں ہوتا ہے؟" وہ بولا "چل، ہم دونوں اسے شیئر کرلیں گے۔"

"حرامی!" میں نے کتاب اُٹھاکر اس کے مُنہ پہ دے ماری۔

رُخصت ہونے سے پہلے میں نے ایک آخری کوشش کی۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا "دیکھ، قمر۔ وہ اس قابل نہیں کہ تو اسے بیوی بناکر گھر لائے۔ اس کا تو بیسیوں سے آنکھ مٹکا رہا ہے۔ پتا نہیں کس کس کے ساتھ اکیلے میں گئی ہو۔"

میں جانتا تھا کہ یہ جھُوٹ ہے، لیکن اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس رشتے کو توڑ دوں۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ اس وقت جیسے یہ میری زندگی کا واحد مقصد تھا۔ میں نے زردی کے متعلق سارے سکینڈل بڑھا چڑھا کر اسے سُنائے۔ دو ایک

چشم دید واقعات جو میں نے خود گھڑے تھے، اسے سُنائے۔

وہ بڑے غور سے میری باتیں سُنتا رہا، یُوں جیسے لذّت لے رہا ہو۔ جب میں سب کچھ سُنا چکا تو بولا "وہ بات بھی بتاؤ نا۔"

"کون سی بات؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بات جب تم خود اسے اکیلے میں لے گئے تھے۔"

غصّے میں مَیں نے گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور سوٹ کیس اُٹھا کر چل پڑا "خُدا حافظ!"

"جلد واپس آنا" وہ بولا۔

"نہیں آؤں گا۔ کبھی نہیں" میں چلّایا۔

"تیرا باپ بھی آئے گا" وہ ہنسنے لگا۔

جہلم پہنچنے کے آٹھ دن بعد ہمیں قمر کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔ امّی نے اِصرار کیا کہ میں ان کے ساتھ شادی پر چلوں، لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔

چھ مہینے بعد مجھے لاہور جانے کا اتّفاق ہُوا۔ میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ قمر کے گھر نہیں جاؤں گا۔ جب میں مال روڈ پر رکشے کا انتظار کر رہا تھا تو ایک باوردی ڈرائیور میرے پاس آیا، سلام کیا، بولا "بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔" جب ہم دونوں موٹر کے قریب گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ زردی بیٹھی ہے!

وہ مجھے ایک قریبی ہوٹل میں لے گئی۔ چائے کا آرڈر دے کر بولی "یہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"سُنا، شادی کیسی رہی؟ وہ سالا ڈیڈی لانگ لگز تجھے تنگ تو نہیں کرتا؟"

"ہٹے!" وہ بولی "وہ تو خالص سونا ہے۔ اتنا انکشنیٹ ہے۔ اتنا ٹنڈر ہے، اتنا جنرس ہے۔ میں کیا بتاؤں تجھے۔"

"تجھ سے محبت بھی کرتا ہے یا نہیں؟"

"اتنی محبت، اتنی محبت - توبہ ہے - محبت سے پاگل کر دیا ہے مجھے - اور پھر اتنی آزادی دے رکھی ہے مجھے - نہ روک، نہ ٹوک - نہ پوچھ، نہ گچھ - اُلٹا ہر وقت مجھے سپائل کرتا رہتا ہے - یہ کھاؤ، یہ پہنو - یوں بنو، یوں سنورو - دوستوں سے ملو - انھیں گھر بلاؤ - فلم دکھاؤ - ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرو - توبہ ہے!" وہ ہنسی "اس نے تو مجھے بٹر فلائی بنا رکھا ہے - زندگی کے متعلق میں نے جتنے پروگرام بنا رکھے تھے نا، سب ختم ہو گئے" وہ قہقہہ مار کر ہنسی -

"کبھی جھگڑا بھی ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا -

"اکثر" وہ ہنسی -

"کس بات پر؟"

"کہتا ہے، بدر کو بلاؤ -"

"مجھے؟"

"ہاں - کہتا ہے جہلم جا کر اسے لے آؤ، زبردستی -" وہ پھر ہنسنے لگی " بس کہتا ہے گھر نہ بیٹھو - گھومو پھرو، ملو ملاؤ - اب میں کہاں تک تیتری بنی پھروں -"

تقریباً ایک سال بعد ایک روز قمر خود ہمارے گھر آ گیا - اس کی صورت دیکھ کر میں گھبرا گیا - لمبا چہرہ - بھویں چڑھی ہوئی - آنکھیں یوں کھلی ہوئی جیسے دنوں سے سویا نہ ہو -

"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا -

"اونہوں - بالکل نہیں -"

"یہ کیا صورت بنائی ہے؟"

"دیکھ لو" وہ بولا -

"یہ زردی کی وجہ سے ہے کیا؟"

"ہاں" وہ بولا -

"اس نے کوئی حرمزدگی کی ہے؟"

قمر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر جیب سے دو کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ میں نے انھیں کھولا۔ دیکھا۔ ارے! وہ تو دونوں ہی محبّت نامے تھے، جو کسی نے آسیہ کے نام لکھے تھے۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔ کہا تھا نا؟"

"ہاں" وہ بولا "تم سچ کہتے تھے۔"

"بات اتنی دُور تک پہنچ گئی ہے کیا؟"

"اگر تم نے مدد نہ کی تو پہنچ جائے گی۔"

"تم نے زردی سے بات کی ہے؟"

قمر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں نہیں کروں گا" وہ بولا "تم آکر اس سے بات کرو۔ تم نہ آئے تو ــــ"

"نہیں، نہیں۔ میں ضرور آؤں گا، ضرور۔"

اگلے روز ہی میں لاہور پہنچا۔ سیدھا قمر کے گھر گیا۔ اس وقت گھر میں زردی اکیلی تھی۔ ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھے اُداس بیٹھی سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تڑپ کے اُٹھ بیٹھی "شکر ہے تم آگئے۔" وہ بولی "روز سوچتی تھی کہ تار دے کر بُلا لوں۔"

میں نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے "میری طرف دیکھ" میں نے حکم چلایا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

"جھوٹی مسکراہٹ نہ مسکا۔ تو اُداس ہے نا؟"

"ہاں" اس نے سر جھکا دیا "اُداس ہوں۔"

"مجھے بتا، وہ کون ہے؟"

"کون وہ؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"جس سے تیرا افیئر چل رہا ہے۔"

زردی نے ایک غُصیلی نگاہ مجھ پر ڈالی۔

"تمھیں محبت نامے موصول ہو رہے ہیں نا؟ جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں"

"ہاں" وہ بولی۔

"کون لکھتا ہے؟"

وہ خاموش رہی۔

"میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ یقین رکھو"

"مجھے یقین ہے" وہ بولی۔

"مجھ سے کچھ نہ چُھپا"

"نہیں چُھپاؤں گی" وہ بولی۔

"تو بتا، کون خط لکھ رہا ہے تجھے؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اُٹھ بیٹھی۔ چابیاں پرس سے نکالیں۔ ایک دراز کھولا۔ اس میں سے ایک لفافہ نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

وہ بند لفافہ تھا۔ لفافے پر آسیہ کا پتا لکھا ہُوا تھا۔ اُوپر ڈاک کا ٹکٹ لگا ہُوا تھا۔ لیکن ابھی وہ پوسٹ نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے حیرت سے زردی کی طرف دیکھا۔

"کھول لو" وہ بولی۔

میں نے لفافہ کھولا۔ "جان سے پیاری آسیہ" ارے! وہ تو محبت نامہ تھا۔ حیرت سے میرا مُنھ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ "یہ تم خود پوسٹ کرو گی؟ اپنے نام خود محبت نامے بھیجتی ہو؟"

"ہاں" اس نے سر ہلا دیا۔

پھر اُس نے تکیے سے ٹیک لگالی۔ کہنے لگی "تمھیں پتا ہے، بدر۔ میں نے خود تمھیں بتایا تھا نا کہ قمر میرے ساتھ بہت ہی اچھا ہے۔ بہت ہی اچھا" وہ رُک گئی۔ "قمر نے چند ماہ مجھ سے اتنی محبت کی، اتنی محبت کی کہ میں پاگل ہوگئی۔ میں اس کی محبت کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

نہیں رہ سکتی۔ اس کی محبت کے بغیر مجھے یوں لگتا ہے جیسے مچھلی پانی سے باہر پھینک دی گئی ہو۔"

وہ رُک گئی۔

"پھر چند ماہ بعد قمر پر ڈیپریشن کے دورے پڑنے لگے۔ دورہ پڑتا ہے تو وہ چُپ ہو جاتا ہے۔ کاٹھ بن جاتا ہے۔ جب پہلا دورہ پڑا تو میں حیران رہ گئی۔ پھر اتّفاق سے بُل ڈاگ آگیا۔"

"بل ڈاگ ؟"

"وہی ہمارا کلاس فیلو، گوہر۔"

"اچھا، وہ" میں نے نفرت سے مُنھ بنایا۔

"کالج میں وہ میرے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا نا۔ یاد ہے، مُجھے اکیلے میں لے جانے کے لیے اُس نے کیا کیا جتن کیے تھے۔"

"بڑا چیپ آدمی ہے، وہ۔"

ہاں، بڑا۔"

"لیکن وہ یہاں پہنچا کس طرح ؟"

"مجھے بازار میں مل گیا تھا۔ یہاں انٹرویو کے لیے آیا تھا۔ میں اسے گھر لے آئی۔"

"سلی گرل۔"

"میں تو اسے کتاب دینے کے لیے لائی تھی۔ اس کی ایک کتاب میرے پاس رہ گئی تھی نا۔ لیکن قمر نے اسے روک لیا۔ یہاں گھر میں ٹھہرا لیا۔"

"ایڈیٹ" میں نے غصّے سے کہا۔

"گوہر کے یہاں آتے ہی قمر میرے پاس واپس آگیا۔ ڈیپریشن دُور ہو گیا۔ اُف! کس شدّت سے واپس آیا قمر۔ اس پر میں نے گوہر کو یہاں سے چلتا کیا۔ اس کے جاتے ہی قمر پھر پتھر کا بن گیا۔ سات آٹھ دن کے بعد قمر نے مجھے ایک خط دیا کہنے لگا: معاف کرنا، میں نے غلطی سے کھول لیا تھا۔ میں نے خط پڑھا تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ وہ خط گوہر کی طرف سے

تھا۔ ڈرٹی لویٹر۔ تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں قسم کا محبت نامہ۔"

"پھر جھگڑا ہُوا؟"

"میرا خیال تھا قیامت آجائے گی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہُوا۔ اُلٹا قمر کے اظہارِ محبت میں اک طُوفان آگیا۔" وہ خاموش ہوگئی، جیسے سوچ میں کھوگئی ہو۔

"پھر کیا ہُوا؟" میں نے پُوچھا۔

"پھر جیسے بات میری سمجھ میں آگئی" وہ بولی۔

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کہ — کہ" وہ اُداس لہجے میں بولی "کہ قمر کی محبت جیتنے کے لیے تھرڈ مین اِز اِے مسٹ۔"

"ارے!" میں چونکا۔

"ہاں" وہ بولی "تھرڈ مین کے بغیر چارہ نہیں۔"

"عجیب بات ہے!" میں گنگنایا۔

"پھر میں نے خود اپنے نام لویٹر لکھنے شروع کر دیے۔" وہ خاموش ہوگئی۔ بڑی دیر تک سامنے خلاؤں میں گھُورتی رہی۔ اس کی آنکھیں پُرنم تھیں، جیسے وہ آنسو پینے کی شدید کوشش کر رہی ہو۔

پھر دفعتہً وہ چونکی۔ اس نے ملتجی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "بدر" وہ بولی "تم آجاؤ، ہمارے پاس۔ پلیز بدر" اس نے نمناک پکار سے منّت کی "فار مائی سیک، فار ہز سیک، فار اور ز سیک — آؤ گے؟" دو موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔

"زردی، اگر مجھے تھرڈ مین بننا گوارا نہ ہو تو —؟"

اُس نے ایک لمبی آہ بھری۔ پھر ایک دم مشتعل ہو کر بولی "تو، تو میں گو ہر کو بلالوں گی۔"

مجھے غصہ آگیا "اس حد تک گر جاؤ گی تُم، آسیہ؟"

"کیوں نہیں" وہ چلائی "قمر کی محبت پانے کے لیے میں کیا نہیں کروں گی۔ آئی وِل ڈُو اینی تھنگ، اینی تھنگ۔"

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

بہترین ادبی شہپارے
پھول کی کوئی قیمت نہیں
آغا بابر
کہانی بیان کرنے کا جو ملکہ آغا بابر کو ملا ہے، وہ کسی اور کے حصے میں کم ہی آیا ہے۔ اِس مجموعے میں آغا صاحب کے ۱۳ نمایندہ افسانے شامل ہیں۔
گرین کارڈ
ڈاکٹر فرخندہ جمال
امریکی معاشرتی پس منظر میں ایک نہایت دِل چسپ مقصدی رُومانی ناول۔
دستک نہ دو
الطاف فاطمہ
ایک عظیم ناول جسے اُردو ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔
چلتا مُسافر
الطاف فاطمہ
المیۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں الطاف فاطمہ کا لافانی ناول، جس میں اُن کا فن بلندیوں پر ہے۔
فیروز سنز
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی
969 0 00612 6
Rs. 90.00